ہفت روزہ
الفتح
کراچی
۷-۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء



خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد : ۲ ــــ شمارہ : ۴۷

۶-۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء

مدیر
ارشاد راؤ



خاص مضامین

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی، قطر : ۷۵ درم
سعودی عرب : ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی - ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر :- ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

ٹیلیفون : ــــ ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

ولی خان - ہوش میں آؤ

ولی خان کھال سے باہر ہو رہے ہیں، کابل ریڈیو پاکستان کے خلاف پراپیگنڈے میں مصروف ہو گیا ہے۔ بھارت کے ناپاک عزائم شدت اختیار کر رہے ہیں، روس دھمکیاں دے رہا ہے کہ برصغیر میں ایک بار پھر وہی حالات پیدا ہوئے جو ۱۹۷۱ء میں جنم لے چکے ہیں تو روس اپنا پہلے والا کردار ادا کرے گا۔

آج پاکستان جن نازک ترین حالات سے دوچار ہے اس سے دشمنوں کا فائدہ اٹھانا فطری بات ہے ــــ کابل، ولی اور ماسکو کا موجودہ رویہ چونکا دینے والا نہیں افغانستان کے حکمرانوں کو شہ ملنے کی دیر ہوتی ہے وہ فوراً کٹھ پتلی بن جاتے ہیں بھارت اور روس کی پاکستان دشمنی مسلمہ حقیقت بن چکی ہے لیکن ولی خان کا نت نیا روپ مزید برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ ان کے چہرے سے نقاب الٹ دی جائے اور ان کی "پاکستان دوستی" سے عوام کو باخبر رکھا جائے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا تو اسے کچھ عرصے بعد احساس ہوا کہ صرف ملٹری کی طاقت کے بل بوتے پر حکمرانی نہیں کی جا سکتی۔ اپنے اعتماد کا کوئی ایک سیاستدان بھی ہونا چاہیئے جو عوام کو سیاسی گورکھ دھندے میں الجھائے رکھے۔ مشرقی پاکستان میں وہ مجیب الرحمٰن سے پہلے ہی سودے بازی کر چکا تھا۔ مغربی پاکستان میں اس کی نظرِ انتخاب ولی خان پر پڑی۔ سردار عبدالرشید کے ذریعے خان صاحب سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اعتماد میں لے لیا۔ یحییٰ خان اپنے پہلے منظورِ نظر ولی خان کو علاقائی لیڈر سے قومی لیڈر بنانے میں مصروف ہو گئے اور پروگرام کے مطابق انہیں مغربی پاکستان کے دورے کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ زعم جلد ہی رفو چکر ہو گیا اور خان صاحب اپنی تمام کوششوں کے باوجود یحییٰ خان کی توقعات پر پورا نہ اتر سکے۔ انہیں مجبوراً صوبہ سرحد تک محدود ہونا پڑا۔

یحییٰ کے عبرتناک زوال، ملک کے نازک ترین حالات اور شدید بحران میں صدر بھٹو نے اقتدار سنبھالا۔ آج بھی اس بحران میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ دشمن بدستور للکار رہا ہے اور پنجاب اور سرحد . . . . .

ہاں، پنجاب اور سرحد کے ہر گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ جنگی قیدیوں کی وجہ سے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ ماؤں کی ممتا تڑپ رہی ہے بہنوں کے نیر بہہ رہے ہیں۔ سہاگنوں کی زبانیں گنگ ہو چکی ہیں، بیٹیوں کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں باپوں کی نیندیں غائب ہیں۔

ہر آہٹ پر کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دہلیزیں، عجب مقام حاصل کر چکی ہیں۔

پیپلز پارٹی ان حالات میں نیپ اور جمعیت سے معاہدہ کرتی ہے کہ ملک اندرونی انتشار سے بچ جائے۔ ہم نے اس وقت اپنا فرض پورا کر دیا تھا کہ نیپ کی خارجہ پالیسی کی بنیاد بھارت اور روس سے گہرے تعلقات، گہرے دوستانہ مراسم ہے اور اس کا ایک بڑا حصہ اکھنڈ بھارت پر یقین رکھتا ہے۔ پیپلز پارٹی اور نیپ

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

غیر ملکی چیزوں کو معیاری قرار دینا ایک مرض بن گیا ہے

بیگم نے میاں کا تحفہ اِس لئے مسترد کر دیا کہ وہ پاکستانی تھا

منیر جہلمی

- ہمیں اپنی فنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں۔
- مقامی اشیاء پر غیر ملکی لیبل لگایا جاتا ہے تاکہ انہیں آسانی سے فروخت کیا جاسکے۔
- ہم غیر ملکی چیزوں کو معیاری قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی اثر ہے۔ فنی اعتبار سے ہماری اشیاء واقعی ناقص ہیں۔

کوئی چیز خریدنے سے پہلے ہم یہ جاننا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ چیز کس قدر پائیدار ہے اور کارکردگی میں کہاں تک بہتر ہے۔ ہم مطلوبہ چیز جب کسی دوکان دار سے معلوم کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ملکی اور غیر ملکی چیزیں رکھ دی جاتی ہیں۔ ہماری نگاہِ انتخاب فوراً غیر ملکی شئے کی طرف اٹھتی ہے اور ہم اُسے خرید لیتے ہیں۔ پاکستانی ساختہ کسی چیز کو خریدنے سے پہلے ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چیز کہاں تک مضبوط ہے۔ استعمال میں کوئی دقت تو پیش نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ اِس کی زندگی کتنی ہو سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد ہی ہم غیر ملکی چیز کو منتخب کرتے ہیں۔ مقامی اشیاء ہم اس وقت خریدتے ہیں۔ جب غیر ملکی چیزوں کا فقدان ہوتا ہے۔ یا پھر دکاندار کو اِس کی اہمیت اور خصوصیت پر لمبا چوڑا لیکچر دینا پڑتا ہے۔ اور ہمیں اس بات پر قائل کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیز جو ہمیں دی جارہی ہے بالکل غیر ملکی معیار کے مطابق تیار کی گئی ہے۔

پاکستانی چیزیں بعض اوقات ہمیں دھوکہ بھی دے جاتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض اشیاء پر غیر ملکی لیبل لگا دیا جاتا ہے جو ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اِس لیبل سے دوکان دار کو دوہرا فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اسے خریدار سے زیادہ بحث نہیں کرنی پڑتی اور وہ چیز کو غیر ملکی اور عمدہ تصور کرتے ہوئے خرید لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ لیبل کی وجہ سے چیز کی زیادہ قیمت وصول کر لیتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک دفعہ بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ شہر میں ایک استعمال شدہ سامان کی دوکان میں ایک صاحبہ کچھ کراکری دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے دوکان دار سے معلوم کیا کہ یہ برتن کہاں کے بنے ہوئے ہیں۔ دوکان دار نے جواب دیا کہ یہ امریکہ کے بنے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی لمبی چوڑی قیمت بھی بتا دی۔ ان صاحبہ نے مزید کچھ دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور برتن خرید لئے۔ حالانکہ وہ برتن پاکستان کے بنے ہوئے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کون سی وجہ ہے کہ ہم پاکستانی چیزیں خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔ اِس کی چند وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں جو چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ ان میں اکثر معیاری اور دیرپا نہیں ہوتیں۔ دوئم یہ کہ ان چیزوں کے استعمال سے لوگ چونکہ بیزار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں فنی اعتبار سے خامیاں ہوتی ہیں۔ ان کی وجہ سے بعض عمدہ اشیاء بھی متاثر ہوتی ہیں اور لوگ انہیں خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔ لوگ نفسیاتی اثر کے تحت ہر اُس چیز کو ناقص تصور کرتے ہیں جو اپنے ملک میں تیار ہوتی ہے۔ سوئم یہ کہ ہمارے ہاں اعلیٰ قسم کی مشینری موجود نہیں ہے، یا اگر موجود ہے تو اُس سے صحیح طور پر کام نہیں لیا جاتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کی نفاست میں کمی آجاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ پاکستان میں ساری کی ساری چیزیں گھٹیا معیار پر تیار کی جاتی ہیں۔ بلکہ بہت سی چیزیں معیار کے اعتبار سے بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی بعض ناقص اور ردی اشیاء سے متاثر ہو کر اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارے ایک دوست ایک دن بازار گئے اور بیگم کے لئے سوٹ کا کپڑا خرید لائے۔ بہت اچھا کپڑا تھا۔ لیکن بیگم نے اُسے بُری طرح رد کر دیا۔ ہمارے دوست کو اِس پر بڑی حیرت ہوئی۔ اور انہوں نے بیگم سے ناپسندیدگی کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ بیگم نے میاں کا تحفہ اس لئے مسترد کر دیا ہے کہ وہ پاکستانی تھا۔ میاں صاحب بڑے شرمندہ ہوئے۔ لیکن فوراً ان کی سمجھ میں کوئی بات آگئی اور انہوں نے بیگم سے وعدہ کیا کہ میں ابھی جا کر کوئی عمدہ قسم کا غیر ملکی کپڑا خرید کر لاتا ہوں۔ وہ واپس اسی دوکان پر گئے اور دوکاندار سے کپڑا تبدیل کرنے کو کہا اور ساتھ ہی اُسے تاکید کی کہ اب جو کپڑا دیا جائے وہ بھی پاکستانی ہو لیکن ڈیزائن مختلف ہو۔ دوکان دار نے بہت ہی عمدہ قسم کا کپڑا نکال کر دیا۔ اور ساتھ ہی پہلے کپڑے کو ناپسند کرنے کی وجہ دریافت کی۔ ہمارے دوست نے جب سارا ماجرا سنا دیا۔ تو دوکان دار نے پاس ہی پڑے ہوئے ایک استعمال شدہ جاپانی کپڑے کا لیبل اتار کر پاکستانی کپڑے پر ٹانک دیا۔ اور کہا کہ اب اسے ضرور قبول کر لیا جائے گا۔ میاں صاحب دوڑے دوڑے گھر پہنچے اور بیگم کو ایک نیا تحفہ پیش کیا۔ انہوں نے کپڑے کو الٹ پلٹ کر جو دیکھا تو ان کی نظریں جاپانی لیبل پر جم کر رہ گئیں۔ کہنے لگیں۔ ہوئی نا بات۔ پہلے آپ کی عقل نہ جانے کہاں تھی۔ اٹھا لائے تھے پاکستانی تحفہ۔ بیگم خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں اور میاں اپنی چہیتی پر ہنس رہے تھے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نفسیاتی طور پر بھی مریض ہیں۔

اب ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم اس مرض سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اپنے ملک کے اندر بنی ہوئی چیزیں استعمال کریں۔ اور اگر ہمیں ان میں کوئی خامی نظر آتی ہے تو اس کی شکایت صنعت کاروں سے کی جائے اور انہیں اپنی ضرورت سے آگاہ کریں کہ ہم جو چیزیں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عمدہ اور اعلیٰ معیار کے مطابق ہوں۔ اور شکایت کے باوجود اگر کوئی تبدیلی نہ کی جائے تو اُس چیز کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ جب اجتماعی طور پر یہ کوشش کی جائے گی تو ممکن ہے کہ ایک دن ہمیں یہ شکایت نہ کرنی پڑے۔

اندرا بھٹو مذاکرات ۶ ہفتوں میں نہ ہو سکے تو کبھی نہیں ہوں گے

واقفِ حال

پاکستان اور بھارت کے درمیان اگر چھ ہفتوں تک امن کے مذاکرات نہ ہو سکے تو پھر برّصغیر میں کبھی امن قائم نہ ہو سکے گا۔

پاکستان کی سیاسی اور جذباتی صورتِ حال اور بین الاقوامی سیاسی حالات کی روشنی میں چھ ہفتوں سے زیادہ کی مدت نہیں دی جا سکتی۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی جذبات بھڑک اٹھیں اور پھر برّصغیر جنگ کی لپیٹ میں آجائے۔ یہ سیاسی مبصروں، بین الاقوامی تعلقات کے ماہروں اور فوجی امور کے ماہروں کی پتی تلی رائے ہے۔

اسلام آباد اور دہلی میں براہ راست بات چیت میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔؟ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لئے اب اسلام آباد، دہلی۔ ڈھاکہ اور ماسکو کے علاوہ ایک پانچویں دارالحکومت کی طرف بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ ہمارے شمال میں افغانستان کا دارالحکومت کابل ہے۔ کچھ عرصہ سے وہاں سے بھی برّصغیر میں کش مکش کی باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ کابل نے اچانک پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا اور پختونستان کا راگ پھر سے الاپنا شروع کر دیا ہے۔ جب سے افغانستان کے وزیر اعظم ماسکو کا دورہ کر کے آئے ہیں اُس وقت سے کابل ریڈیو نے پاکستان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے اور حکومتِ افغانستان نے باقاعدہ سرکاری فیصلہ بھی کیا ہے۔ جس کے مطابق حکومت افغانستان نے بعض ایسے مسائل پر پروپیگنڈے کو ازسرِنو شروع کرنے کا اعلان کیا ہے جو بقول افغانستان ابھی طے ہونے باقی ہیں۔ ان مسائل کا خیال افغانستان کی حکومت کو ماسکو کے حالیہ دورہ سے پہلے کیوں نہیں آیا۔ کابل کے وزیر اعظم کے دورہ کی تاریخ صدر بھٹو کے دورے سے

عین پہلے رکھی گئی اور پھر وہ صدر بھٹو کے قیام کے دوران بھی وہیں تھے اور ان کے بعد آئے۔ اُن کا مشترکہ اعلامیہ بھی بعد میں جاری ہوا۔ کابل کی پالیسی میں تبدیلی کے بعد ہمارے ہاں ولی خان کے لہجے میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ ۱۴ اگست تک مارشل لاء قائم رکھنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے باوجود وہ ۱۴ اپریل کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں مارشل لاء کے خلاف ووٹ دینے کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ ہر مارشل لاء کی مخالفت کر کے چیمپین بننے کی فکر میں ہیں۔ صدر بھٹو نے جب یہ اعلان کیا کہ مجھ پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔ اور اگر بھارت کے آگے جھکنے کی بات ہے تو کوئی دوسرا صدر تلاش کر لیا جائے۔ ولی خان بجائے اس کے کہ صدر کے جرأت مندانہ موقف کی حمایت کرتے۔ انہیں فوراً یہ فکر ہوا کہ صدر اگر مستعفی ہوتے ہیں تو پہلے سے متبادل شخصیت تلاش کر لی جائے۔ اس سے ان کی "جمہوری" ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ڈوری ہے جس کا ایک سرا ماسکو میں ہے۔ یہ کابل میں ہل رہی ہے۔ پشاور میں ہل رہی ہے اور ڈھاکہ میں ہل رہی ہے۔

روس ایک منصوبہ بنا چکا ہے اور وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ اس میں دو متبادل راستے ہیں۔

(۱) ایشیائی سلامتی کا منصوبہ۔ افغانستان۔ مغربی پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش ایک بلاک بن جائیں۔ جس کی سرپرستی روس کرے، تاکہ اس کو اپنی سرحدوں اور چین کی سرحدوں پر کچھ طفیلی اتحادی مل جائیں جو اس کے اشاروں پر رقص کرتے رہیں۔

(۲) مغربی پاکستان پر ایک طرف افغانستان ہے اور دوسری طرف بھارت سے فوجی دباؤ بھی ڈالا جائے تاکہ اس کے سامنے جھک کر وہ "ایشیائی سلامتی" کے منصوبے پر یا اپنی غلامی کی دستاویز پر دستخط کر دے، یا پھر لڑ لڑا کر ختم ہو جائے۔

خوش قسمتی سے اندرونِ پاکستان۔ صدر بھٹو کے خلاف فضا پیدا کرنے کے لئے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ جنگی قیدیوں کا مسئلہ پنجاب کے لئے جذباتی نزاکت رکھتا ہے۔ کراچی میں بہاریوں کا مسئلہ ہے۔ سرحد اور بلوچستان میں اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، تو نیشنل عوامی پارٹی اپنے مفادات کے لئے بحران پیدا کرنے کو موجود ہے۔ سندھ میں سندھی اردو کا تنازعہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ یہ دباؤ بھٹو کو بھارت کے آگے جھکنے پر بھی مجبور کر سکتا ہے اور انہیں راج سنگھاسن چھوڑنے پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔ کیونکہ بھارت، بنگلہ دیش اور روس ۲۰ اور ۲۵ سال کے معاہدوں سے مسلح ہیں۔ پاکستان برّصغیر میں اکیلا ہے۔ بھارت نے بنگلہ دیش کو جو پاکستانی جنگی قیدی۔ مقدمہ چلانے کے لئے حوالہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر رُوس نے کوئی رّدِعمل ظاہر نہیں کیا۔

نئی دہلی۔ بھٹو۔ اندرا ملاقات کے سلسلے میں تاخیر اسی لئے کر رہا ہے کہ اس عرصے میں صدر بھٹو اور زیادہ کمزور ہو جائیں تاکہ ان سے ہر شرط منوانا ممکن ہو۔ افسروں کی سطح پر بات چیت کی پیش کش بھی اسی سلسلے میں ہے۔ جنگی قیدی مجیب کے حوالے کرنے کا اعلان بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ بھارت سے سندھی میں خصوصی پروگرام بھی نئے سندھیوں اور پرانے سندھیوں میں نفرت پھیلانے کے لئے شروع کئے گئے ہیں۔ یہ ایک طرح سے صدر بھٹو کا گھیراؤ ہے۔ تاکہ وہ ماسکو بالخصوص اور بھارت کی مرضی کے مطابق سمجھوتہ کر سکیں۔

اِس وقت بھارت کے عوام اور پاکستان کے عوام جنگ نہیں چاہتے۔ وہ امن کے حق میں ہیں۔ بھارت کے تین روزناموں میں صدر بھٹو کے جو انٹرویو شائع ہوئے ہیں۔ انہیں بھارت کے غریب اور امن پسند عوام نے بہت پسند کیا ہے اور ان کے ذہنوں میں ان کے جنگجو حکمرانوں نے ایک ضدی اور لڑاکا بھٹو کا جو تصوّر بٹھایا تھا وہ بڑی حد تک ختم ہوا ہے۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر صدر بھٹو نے ایک سوال کے جواب میں درست کہا کہ وہ بھارت سے تعلقات کی بحالی کے لئے سوئٹزرلینڈ کے سفارتی ذریعے کے علاوہ اور کیا ذریعہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک نہایت مؤثر اور براہ راست ذریعہ بھارتی اخبار نویسوں کے ذریعے قائم کیا ہے۔ جس کا اثر براہ راست بھارت کے عوام پر پڑے گا۔

مسز اندرا گاندھی۔ جو فتح کے نشے میں ہیں انہیں بھارت

ماسکو، کابل، پشاور، نئی دہلی۔ صدر بھٹو کا گھیراؤ کر رہے ہیں

کی وزارت خارجہ کے افسران اور روسی سفارت خانے کے عملے نے گھیر رکھا ہے۔ ڈی۔ پی۔ دھر اور ٹی این کول اپنے خصوصی مفادات کو بروئے کار لانے کے لئے ماسکو کی لائن کو چلا رہے ہیں۔ بیورو کریسی بھارت کی ہو، پاکستان کی، اس کی عوام دشمنی مسلّم ہے۔ وہ دونوں ملکوں کے عوام اور ان کے منتخب نمائندوں کو قریب نہیں آنے دیتی۔

ان سرکاری افسروں کے بڑی طاقتوں سے جو رابطے ہیں ان کی وجہ سے بھی بات چیت آگے نہیں بڑھ پاتی۔ افسروں کی سطح پر بات چیت کا مسئلہ خود افسروں نے ہی اٹھایا ہے افسروں کے مذاکرات کا پہلے آج تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس لیے موجودہ خطرناک سیاسی بحران میں افسروں کے مذاکرات انتہائی بے معنی ہیں۔

سردار سورن سنگھ کا بذریعہ کابل ماسکو جانا، ڈی پی دھر اور ٹی این کول کی سفارتی سرگرمیاں اس سلسلے کی کڑیاں ہیں اور انہی کی وجہ سے بھٹو کی پیشکش کے باوجود بھارت سے رسمی طور پر کوئی دعوت نہیں آرہی ہے، نئی دہلی کے علاوہ کسی اور دارالحکومت میں ملاقات کے لیے بھی فضا ہموار نہیں ہے۔ ماسکو کی بھی دلچسپی یہی نظر آتی ہے کہ صدر بھٹو اپنی مقبولیت اور کھو بیٹھیں تو بات چیت روسی حکمت عملی کے مطابق ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر چار پانچ ہفتوں میں اندرا بھٹو ملاقات نہ ہو سکی اور جنگی قیدیوں کا مسئلہ طے نہ ہو سکا تو صورتِ حال پھر ہمیشہ کے لیے خطرناک ہو جائے گی اور برصغیر کی کشیدگی کا یہ مسئلہ آئندہ کبھی بھی طے نہ ہوگا۔ صدر بھٹو ایک ایسی شخصیت ہیں جو تاریخ کے اس موڑ کے مطابق تاریخی تقاضوں کو پورا بھی کرتے ہیں۔ تاریخ نے پاکستان کو اس وقت شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے کھڑا کیا ہے اور اب پاکستانی قوم اپنی تمام تر جذباتیت کے باوجود بہت سی ایسی باتیں تسلیم کرنے کو بھی تیار ہے جو وہ تاریخ کے کسی اور موڑ پر تسلیم نہ کرتی اور صدر بھٹو ایک ایسی شخصیت ہیں جن کو مغربی پاکستان کے عوام کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے، بے پناہ مقبولیت ہے۔ پارلیمانی طور پر وہ اکثریتی پارٹی کے قائد ہیں۔ انہیں فوج پر بھی اس وقت کنٹرول ہے اور وہ جو قدم بھی اٹھاتے ہیں جو فیصلہ بھی کرتے ہیں اس کو عوام سے تسلیم کروانا بھی جانتے ہیں۔ اگر بھارت ایسے شخص سے بات چیت نہیں کر سکتا تو وہ آئندہ کسی پاکستانی سے بات چیت کی امید نہ رکھے۔ اگر کوئی فوجی برسر اقتدار آئے گا تو وہ اپنی فوجی جنتا کو خوش رکھنے کے لیے جنگ کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکے گا جس سے بھارت کو بھی نقصان پہنچے گا اور پاکستان کو بھی!

متبادل سیاسی شخصیت جو بھارت کو نظر آرہی ہے وہ ولی خان کی ہے مگر وہ اپنے دونوں صوبوں سرحد اور بلوچستان میں واضح اکثریت نہیں رکھتے، کئی علاقوں میں ان کی مقبولیت قطعی طور پر نہیں ہے۔ جس دوسری پارٹی کے سرپر وہ اکثریتی پارٹی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس سے یعنی جمیعت العلمائے اسلام سے اندرون خانہ ان کی بری طرح ٹھن گئی ہے۔ نیپ بلوچستان اور سرحد میں بھی نظریاتی تصادم ہو گیا ہے۔ بلوچستان میں اکبر بگٹی کے دو ارکان اسمبلی نیپ کے ساتھ نہیں رہے۔ کچھ عرصہ بعد سرحد بلوچستان میں بالآخر گورنر راج ہوگا اس سے ولی خان کی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اندرا میں اگر سیاسی بصیرت ہے اور وہ برصغیر کی تاریخ میں اپنے مسخ شدہ کردار کو روشن کردار بنانا چاہتی ہیں، جسے برصغیر کے عوام ہمیشہ امن کے نام پر یاد رکھیں گے تو انہیں فوراً بات کرنے میں پہل کرنی چاہیئے بھارت بڑا ملک ہے اس کے عوام کے مسائل بھی بہت زیادہ ہیں ان کے مسائل کی طرف توجہ دے یہ اس کا پہلا فرض ہے "بنگلہ دیش" کا پتلا کھڑا کر کے مشرقی پاکستان کے عوام کی آزادی کا خون تو ہوا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ بھارت نے اپنے لیے بھی مسائل پیدا کر لیے ہیں۔ اس وقت اگر مسز اندرا گاندھی اپنے عوام میں بھارت کی فوجی فتح کا سوانگ رچائے ہوئے ہیں، وہ تصوّر "بنگلہ دیش" کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے ساتھ تار تار ہوگا۔ اور پھر بھارت میں ہی اندرا گاندھی کی پالیسیوں کے خلاف شور بلند ہونا شروع ہوگا۔

"بنگلہ دیش" کی خطرناک صورتِ حال عالمی رائے عامہ کو بھی متاثر کرے گی۔ بنگلہ دیش میں مقیم غیر ملکی سفیر اپنی جو رپورٹیں اپنے ممالک کو بھیج رہے ہیں وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ وہ یہی لکھ رہے ہیں کہ یہاں اس "اتھارٹی" کا پتہ نہیں چلتا جس سے کسی مسئلے پر فیصلہ کن بات کی جائے۔

مشرقی پاکستان کے عوام بھارتی توسیع پسندوں روسی ترمیم پسندوں اور ان دونوں کے پٹھوؤں کے خلاف ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہاں صورتِ حال روزانہ بگڑ رہی ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ بھارت کے عوام میں بھی بھارتی فوج کی بربریت اور مکتی باہنی کے مظالم کے خلاف احتجاج شروع ہوگا۔ اس وقت اندرا گاندھی بھی اپنے آپ کو گھیراؤ میں پائیں گی۔ وقت یہی ہے کہ یہ بات چیت ہو جائے۔ اور اندرا گاندھی کو یہ شرط بھی نہیں لگانی چاہیئے کہ بھٹو مجیب ملاقات نئی دہلی میں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ بھٹو صاحب مجیب کو دنیا کے کسی کونے میں بھی مل سکتے ہیں.. نئی دہلی میں نہیں! ڈھاکہ میں ہی کیوں نہ ملا جائے۔ نئی دہلی ڈھاکہ کو "آزادی" کے بعد بھی اپنی کالونی کیوں رکھنا چاہتا ہے؟

آئندہ شمارے میں

● —— جامعہ کراچی میں کون کیا ہے؟

یونیورسٹی کے حالیہ ہنگاموں کے پس پردہ کونسا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے؟

سنسنی خیز انکشافات اور دستاویزی ثبوت

بدعنوانیوں اور عوام دشمن سازشوں سے پردہ اُٹھتا ہے

وقارالنساء کالج راولپنڈی کے پانچویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۰ مارچ میں جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنے خطبۂ صدارت میں نئی تعلیمی پالیسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ خطبہ کے چند اہم اقتباسات نذرِ قارئین ہیں۔ —————— (ادارہ)

تعلیمی پالیسی کو آنکھ مچولی کا کھیل نہ بنائیے

قدرت اللہ شہاب

نئی تعلیمی پالیسی سادہ، پاکیزہ، جرأت مندانہ اور ایک دیانت دارانہ کوشش ہے۔ اس میں کمی بیشی کی گنجائش ہے۔ یہ ایک لچک دار پالیسی ہے۔ عملی تجربے کے ذریعہ اسے مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ صدر بھٹو نے بھی واضح طور پر یہ اعلان کر دیا ہے کہ یہ حرفِ آخر نہیں۔ اس میں ترمیم و اضافے کی پوری پوری گنجائش ہے۔ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے پیشِ نظر اس پالیسی کو زیادہ سے زیادہ عوامی مفاد میں ڈھالا جاسکتا ہے

آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ راولپنڈی میں کچھ اساتذہ نے اپنے چند مطالبات کے لئے مظاہرہ کیا۔ ان میں سے ایک مطالبہ اساتذہ کی تنخواہوں کے اسکیل کو قومی اسکیل کے برابر مقرر کرنا ہے۔ اطلاعات کے مطابق چند پلے کارڈوں پر تحریر کی گئی تھی "چپراسی کی تنخواہ ۱۳۸ روپے اور استاد کی تنخواہ ۱۲۰ روپے، کیا استاد اور چپراسی کے کام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے دلی کوفت ہوئی۔ اساتذہ کا معاملہ اُن کی اہلیت کے اعتبار سے یقیناً علیحدہ ہے۔ مگر ان کے معاملے کو کھینچ کھانچ کر غریب چپڑاسیوں سے ملانے کی کوشش غیر ضروری ہے۔ اساتذہ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مزدوروں میں غریب چپڑاسی بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس قسم کے دلائل دینے کی بجائے ہمیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئیے۔ کیا محض کام کی نوعیت سے ہمارے، آپ کے اور چپڑاسیوں کے درمیان عزت اور وقار میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ؟

جہاں تک تنخواہوں کے اسکیل کا تعلق ہے۔ میں اساتذہ کو یقین دلاتا ہوں کہ نئے منصوبے میں اُن کے معاملے پر اچھی طرح غور و فکر کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالغفور غفاری کو وزارتِ تعلیمات کی طرف سے ایک مراسلہ بھی روانہ کیا گیا۔ یہ میری رفیقانہ گزارش ہے کہ تعلیمی پالیسی کو آنکھ مچولی کا کھیل نہ بنایا جائے۔ ہم ہمیشہ اپنے تمام کارڈوں کو میز پر رکھیں گے، اس کے عوض ہم اساتذہ، طلباء اور ان کے والدین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہی ایک بامقصد طریقہ ہے کہ ہم نئی تعلیمی پالیسی کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنا سکیں۔ جہاں تک میرے تاثرات کا تعلق ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پالیسی سودمند ثابت ہوگی۔ کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی۔ بتدریج تکمیل کے مراحل طے کرتی ہے علم بھی ایک مسلسل، انتھک سفر کا نام ہے۔ تلاش و جستجو کے اس سفر کو جاری رکھنا ہوگا۔ ہم نے نئی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی پر ایک عام نکتہ چینی یہ کی جاتی ہے، کہ پالیسی تو بہت اچھی ہے۔ مگر اسے قابلِ عمل بنانے کے لئے ہمارے پاس وسائل کہاں سے آئیں گے۔ ؟ یقیناً یہ سوال اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارا ملک غریب ہے۔ حالیہ واقعات نے ملکی معیشت کو تباہ کر دیا۔ وقتی طور پر ہم زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ مگر کیا یہ چیزیں ہمارے حوصلے کو پست کر سکتی ہیں۔ ہماری جہد، اور منصوبے کو روک سکتی ہیں۔ انسانی ترقی کا سب سے بڑا خزانہ "اپنی مدد آپ اور خود انحصاری کا اصول ہے۔ اس پالیسی کی تکمیل کی ذمہ داری صرف مملکت پر عاید نہیں ہوتی۔ عوام کے تعاون، اشتراک، خیر سگالی کے جذبات کے ذریعہ اس عظیم ذمہ داری کو پایۂ تکمیل تک آسانی سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ تعلیم سے متعلق ہر لفظ کو اساتذہ، طلباء، والدین اور عوام کی رائے کی روشنی میں پورا کیا جائے گا۔

نئی پالیسی کے سلسلے میں تیسرا سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی کا بنیادی فلسفہ یا نظریہ کیا ہے۔ ؟ سب سے آسان سوال کا جواب ہے کہ یہ پالیسی پاکستان کے لئے تیار کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کا نظریہ وہی ہے جو پاکستان کا ہے۔ اس سے مختلف کیوں کر ہو سکتی ہے۔ ؟ تعلیم کا مقصد افرادی قوت کو مجتمع کرنا۔ اور تربیت دینا ہے۔ جو نظریۂ پاکستان کے تحفظ میں مثبت کردار ادا کر سکے اور ملک کی تو ش عالی سلامی میں اپنی قومی اور بین الاقوامی ذمہ داری کو پورا کرے۔

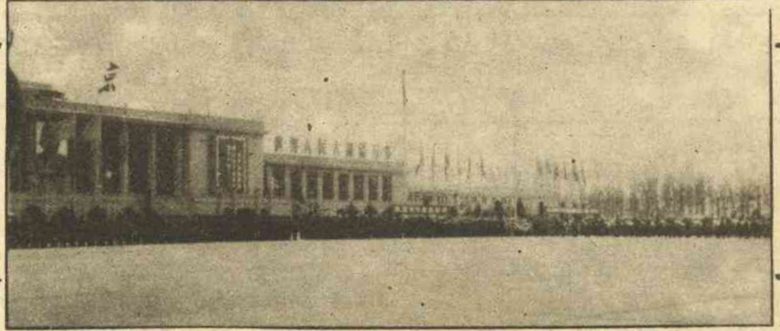
ہمارے اوپر بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھنا ہے۔ آرٹ، کلچر اور فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں میں ہمیں بیش بہا اضافہ کرنا ہے۔ ناانصافیوں کا چیلنج قبول کرنا ہے۔ ترقی یافتہ قوموں نے اپنے یہاں تمام سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کا خاتمہ کر دیا۔ وہ سائنسی ایجادات میں برق رفتاری سے منزلیں طے کر رہی ہیں انہوں نے اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ کر لیا۔ اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہی ہیں۔ ہمیں بہت کچھ سیکھنا اور سمجھنا ہے۔ ہمیں دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا ہوگی۔ ہمیں اپنے اندر کمزوری کے بغیر قوتِ برداشت، جذباتیت کی جگہ ٹھہراؤ اور خوف کے بغیر انصاف کے تقاضے کی تکمیل کی خوبیاں پیدا کرنا ہوں گی۔ ہمیں اپنے نصف ملک کو بھارت کے تسلط سے آزاد کرانا ہوگا۔ اور اس وقت تک اطمینان اور سکون سے نہیں بیٹھنا ہوگا جب تک بھارت سے ہمارے جنگی قیدی صحیح سلامت واپس نہیں آجاتے۔ ہمارے درمیان چند افراد نے بدعنوانی، اقرباء پروری، لالچ اور لوٹ کھسوٹ کے جو گہرے بادل پھیلا دیئے ہیں۔ اسے صاف کرنا ہوگا۔ ایک آزاد، خود مختار اور باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے ہمیں جنگ کرنی ہوگی۔

عزت اور وقار کی جنگیں، اسلحہ اور ہتھیاروں سے نہیں لڑی جاتیں۔ ہمیں ثقافت، روحانیت، عقل و دانش، اقتصادیات اور جسمانیات کے ہر ہتھیار کو استعمال میں لانا ہوگا۔ ہمیں آنے والی نسل کو اس کے لئے تیار کرنا ہوگا۔

تاریخ کے صفحات میں ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے اپنے دور کے ظلم و جبر، ناانصافیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ آج کا نوجوان بھی اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ناانصافیوں اور محرومیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ جذبات وہی ہیں مگر اسٹائل تبدیل ہو گیا۔ آج کا نوجوان سوسائٹی کی ملمع سازی، ریاکاری اور زیادتیوں سے ناراض ہو کر ہپی بن جاتا ہے اور منشیات کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ یہ ناراضگی کے اظہار کا جدید طریقہ کہا جاتا ہے۔ اس کا حل نوجوان نسل میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے بلکہ پرانی نسل کو ٹٹولنا چاہیئے اور پھر حل کے راستے تلاش کرنے چاہئیں۔

پیکنگ میں ۴۸ گھنٹے - آخری قسط

الوداع - اے پیکنگ کی مسکراہٹو'
پیکنگ کی دیوارو



میرے گھر میں انقلاب آگیا ہے - صدر بھٹو

محمود شام

گریٹ ہال کے ایک حصے میں پاکستان اور چین جمع ہیں پہلے روز بھی ہم اسی جگہ بیٹھے تھے اور آج جب ہم ایک دو گھنٹے بعد رخصت ہونے والے ہیں۔ آج بھی ہم اسی جگہ بیٹھے ہیں۔ میزیں سجی ہیں، کھانے مشروبات ــــ چین کی طرف سے آج چو این لائی، یہہ شین ینگ، لی سین نین لی تیہہ شنگ، کوموجو، سو، سیانگ خسین، تیہہ جنگ خسین، چی بنگ مینہ، وو یہتہ، سیاؤ چنگ کوانگ اور ان کے علاوہ کمبوڈیا کی جدوجہد آزادی کے عظیم قائد اور سربراہِ مملکت سمدک نوردم سہانوک، مادام سہانوک، سمدک پن نوتھ (کمبوڈیا کے عظیم وزیراعظم) اور ان کی مادام ہسرین چھاک (وزیرخارجہ) مادام سرین چھک، چین میں شمالی کوریا کے سفیر ہیون جن سیوک۔ ان کی اہلیہ، کرمیس (چین میں کمبوڈیا کے سفیر) پیکنگ میں جمہوریہ ویت نام کے عبوری ناظم الامور نگوین تین۔

عظیم ملکوں کے عظیم قائد جن سے عوامی قوت اور سامراج کے خلاف جذبۂ حریت کی روایتیں زندہ ہیں۔ میں ایک کم مایہ، شکست خوردہ اور افسردہ قوم کا ایک فرد!! یہ جن کے چہرے عوامی جدوجہد کی راہ کی صعوبتوں، تکلیفوں، قربانیوں کے آئینے، جن کی پیشانیاں عزم، استقلال کی نشانیاں ــــ آج کی عالمی تاریخ کا عنوان یہی لوگ ہیں

صدر بھٹو کہہ رہے ہیں . . . انہوں نے اور ان کی پارٹی نے چین میں قیام کے دوران بڑے مفید اور نتیجہ خیز مذاکرات کیے۔" ہم چین سے رخصت ہو رہے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ چیئرمین ماؤ زے تنگ اور دوسرے عظیم رہنماؤں کی قیادت میں چین کے عظیم عوام پاکستان کے ساتھ ہیں اور اپنی منصفانہ جدوجہد اور جائز مقصد کے لیے، ہمیں چینیوں کی مکمل اور غیر مشروط حمایت حاصل ہے ہم پاکستان کے وقار، عزت، سالمیت کا آخر دم تک دفاع کریں گے اگر ہمیں اپنے مقاصد پر یقین ہے تو یہ تکلیفوں کے سال گزرنے میں دقت نہیں ہوگی۔ ہم آرام نہیں کریں گے، ہم تھکیں گے نہیں۔ ہم اپنی کوششیں نہیں چھوڑیں گے۔ ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے حتیٰ کہ ہمارے ہم وطن آزاد ہو جائیں اور حتیٰ کہ ہماری سرزمین کو انصاف مل سکے۔ ہم اپنے عوام کو طاقت بخشیں گے۔

اپنے باہمی مفادات، ایشیا اور تیسری دنیا میں امن کے قیام کے لیے پاکستان اور چین کے تعلقات آگے اور آگے بڑھتے رہیں گے۔"

وزیراعظم چو این لائی جواباً کہہ رہے ہیں "اگرچہ صدر بھٹو اور دوسرے ممتاز پاکستانی مہمانوں کا یہ دورہ انتہائی مختصر رہا، پھر بھی صدر بھٹو اور چیئرمین ماؤ زے تنگ کے درمیان ملاقات اور دونوں ملکوں کے دوسرے لیڈروں کے درمیان ملاقاتوں سے ہم نے جنوب مشرقی برصغیر میں صورتِ حال کے بارے میں مکمل افہام و تفہیم کی۔ ہم نے اپنے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات اور باہمی دلچسپی کے سوالات پر غور کیا۔"

چو این لائی کہہ رہے ہیں ــــ "پاکستان ایک عظیم ملک ہے اور پاکستان کے عوام عظیم ہیں۔ جارحیت کے خلاف پاکستان کے عوام کی جدوجہد جائز ہے۔ چین کی حکومت اور عوام ہمیشہ کی طرح آپ کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ منصفانہ جدوجہد ہمیشہ فتح مند ہوتی ہے۔"

اب جامِ صحت تجویز کرنے کی رسم چل رہی ہے بھٹو صاحب صدر ماؤ زے تنگ، وزیراعظم چو این لائی، پرنس سہانوک کا جامِ صحت تجویز کرتے ہیں اور پھر ایک ایک میز پر جاتے ہیں۔ ہر ایک سے کچھ بات بھی کرتے ہیں ہماری میز کی طرف آتے ہوئے کہنے لگے ــــ "شام! تمہارے تو مزے ہو رہے ہیں۔"

میں نے کہا ــــ "کیا مزے ہیں آپ چیئرمین ماؤ سے ملنے تو اکیلے چلے گئے۔"

صدر بھٹو کہنے لگے ــــ "کیا کروں، جیسے ان لوگوں کی خواہش تھی۔ میرا بیٹا مرتضیٰ بھی مجھ سے لڑ پڑا کہ مجھے کیوں ساتھ نہیں لے کر گئے۔ میرے تو اپنے گھر میں انقلاب ہو گیا۔"

بھٹو صاحب تمام میزوں سے ہو کر واپس پہنچ گئے ہیں۔ اب وزیراعظم چو این لائی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک ایک میز پر جا رہے ہیں۔ رات وہ ہمارے صدر سے اس بات میں پیچھے رہ گئے تھے مگر آج انہوں نے بھی ایک ایک میز پر جا کر جامِ صحت تجویز کیا ہے۔ غلطی سے ایک میز پر جانے سے رہ گئے ہیں تو واپسی میں انہیں خود ہی یاد آیا تو ہنستے ہوئے ان لوگوں سے معافی چاہی



اور پھر ان کے لیے جام صحت تجویز کیا۔

اب مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کی رسم ہونا ہے مشترکہ اعلامیہ رات کے تین بجے تک تیار ہوتا رہا۔ بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ پاکستان اسے "مشترکہ اعلان" (JOINT DECLARATION) کا نام دینا چاہتا تھا مگر عوامی جمہوریہ چین کے رہنماؤں نے اس کے لیے "مشترکہ اعلامیہ" (JOINT COMMUNIQUE) کا نام ہی مناسب سمجھا ہے۔ صدر بھٹو اور وزیر اعظم چو این لائی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ بڑی لمبی میز پر سبز غلاف سجا ہے۔ صدر بھٹو کے پیچھے پاکستانی سرکاری وفد کے ارکان —— اور وزیر اعظم چو این لائی کے پیچھے چینی وفد کے ارکان ہیں۔ دونوں رہنماؤں نے ایک بار غور سے پڑھنے کے بعد اس پر دستخط کیے ہیں۔ دونوں طرف دستاویزوں کا تبادلہ ہوا ہے اور اس کے بعد پھر دستخط ہوئے ہیں —— تالیاں بج رہی ہیں چین اور پاکستان کی دوستی اور مستحکم ہو گئی ہے۔

چین میں پاکستان کے سفیر مسٹر کے ایم قیصر نے وہ دونوں قلم، جو صدر بھٹو اور وزیر اعظم چو این لائی نے دستخطوں کے لیے استعمال کیے، لاکر بیگم بھٹو کو یادگار کے طور پر دیئے ہیں۔

اب ہمارے قافلے کو واپس چلنا ہے۔ پیکنگ میں ہمارے قیام کے یہ آخری لمحے ہیں۔ محبت، اخوت، جذبات مسکراہٹوں اور پیار میں بسے ہوئے ۴۸ گھنٹے گزرنے کو ہیں۔ یہ گریٹ ہال —— جو اپنی وسعتوں سمیت ہماری آنکھوں میں اتر گیا ہے۔ جانے اب ہم یہاں کب آئیں۔ ہم اپنے اوورکوٹ اور ٹوپیاں واپس لے کر باہر نکل رہے ہیں۔ دروازہ گھوم رہا ہے۔ تن ان من سکوائر آج رنگوں سے سجا ہوا ہے۔ نغموں میں گونج رہا ہے۔ میں دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی مبہوت ہو کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ تاحدِ نظر رنگ بکھرے ہیں۔ ایک شکست خوردہ اور بھٹکی ہوئی قوم کے افراد کے لیے محبت اور گرمجوشی کا یہ اہتمام —— پہلے روز بھی پیکنگ کے عوام اسی طرح خیر مقدم کرتے —— مگر ان کی تیاریوں پر برف پڑ گئی تھی —— مگر آج برف اور سردی پاکستان اور چین کی محبت کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔ میں نے اب تک چینیوں کے والہانہ جذبات کی کہانیاں سنی تھیں تصویریں دیکھی تھیں یا فلموں میں یہ رنگ دیکھے تھے آج میری اپنی آنکھیں ان رنگوں کو دل میں اتار رہی ہیں چین کی عوامی سپاہِ آزادی مسلح ملیشیا، لڑکیاں بھی بندوقیں

ہمارا کوئی انقلابی زمیندار چو این لائی نہ بن سکا

لیے، نوجوان بھی بندوقیں لیے۔ دُور دُور تک، سُرخ، سبز زرد، گلابی اور نیلے رنگ بکھرے ہیں —— اودے اودے نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن ۔ میں دم بخود کھڑا ہوں کہ چینی مترجم آکر کہتا ہے:-

"چلیئے چلیئے آپ کو ائیر پورٹ پہنچنا ہے، اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

میں سُرخ رنگ والی پانچ سیٹر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بینڈ پاکستانی اور چینی دھنیں چھیڑ رہے ہیں ایک دم شور بلند ہوتا ہے۔ مَیں گاڑی سے نکل کر دیکھتا ہوں۔ صدر بھٹو، وزیر اعظم چو این لائی کے ساتھ باہر نکل رہے ہیں باہر ہجوم بے قراری سے چین اور پاکستان کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے لہرانے لگتا ہے اور صدائیں بلند ہوتی ہیں —— "صدر بھٹو کو گرمجوشی سے الوداعی سلام" "دوستانہ پاکستانی مہمانوں کو گرمجوشی سے الوداعی سلام"

ایک کھلی موٹر میں صدر بھٹو چینی ٹوپی سر پہ رکھے چو این لائی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ہوا سے سڑک کے درمیان میں لٹکے سرخ بینر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف لگے لاؤڈ سپیکروں سے پاکستانی اور چینی موسیقی کی تانیں بلند ہو رہی ہیں —— پھر یہ گاڑی رنگوں میں کھو جاتی ہے۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھ جاتا ہوں، میر جمیل الرحمٰن اپنا کیمرہ سنبھال رہے ہیں۔ اصحاب نقوی کو جلدی میں اپنی گاڑی نہ مل سکی۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئے ہیں۔

اب ہم عوامی سپاہِ آزادی کے سجیلے جوانوں، کمانڈروں، لڑاکوں، مسلح ملیشیا، سرکاری دفتروں کے لوگوں، طلبہ، چین کے محنت کش عوام، نوجوان لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں کے بکھرے ہوئے رنگوں، محبت بھری مسکراہٹوں، جوشیلے نعروں کے درمیان میں سے گزر رہے ہیں۔ رنگوں کے سیلِ رواں ہیں، نغموں کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ شاہراہِ شانگان تاحدِ نظر رنگوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ ہمارے دونوں طرف وردیوں میں ملبوس خواتین اور نوجوان بندوقیں ہلا ہلا کر رخصت کر رہے ہیں۔ چین کے مختلف لوک لباسوں میں ملبوس لڑکے لڑکیاں گلدستے اور رنگین پتیوں سے ہمیں رخصت کر رہے ہیں۔ تن ان من چوک سے لے کر رنگوں اور نغموں کی یہ لہریں ہمیں نہ جانے کہاں تک لے آئی ہیں۔ ان چینیوں کے چہروں پر مسکراہٹیں کھوکھلی نہیں ہیں ان سے خلوص —— انتہائی گہرا خلوص جھلک رہا ہے۔ ہمیں یہ دو اڑھائی میل طے کرنے میں پون گھنٹہ لگ گیا ہے۔ ہماری آنکھیں رنگ ہی رنگ اور مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں دیکھتی رہی ہیں، کان نغمے ہی نغمے سنتے رہے ہیں۔ یا پھر کچھ اس قسم کی آواز کان میں پڑتی رہی ہے —— "لانگ لو بھوٹو" —— پیکنگ سے نکل کر ہم پیکنگ کے مضافات میں داخل ہو گئے ہیں۔

—— اے پیکنگ —— الوداع —— پیکنگ کی دیوارو —— الوداع —— پیکنگ کی مسکراہٹو الوداع! ہم تو منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہم خدا جانے پھر یہاں کتنی بار آئیں اور آپ کب تک ——

حکمران طبقہ نے بیرونی جارحیت کو کچلنے کی بجائے چینی گولیاں عوام کے سینوں میں پیوست کر دیں

--- ہمارے لئے ان گرمجوشیوں، مسکراہٹوں اور محبتوں کا اظہار کرتے رہیں گے۔ ہمارے عوام آپ کے عوام سے محبت کرتے ہیں بے ساختہ چاہتے ہیں۔ انتہائی قدر کرتے ہیں۔ مگر انہیں آج تک اپنی مرضی سے قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملا انہیں اپنا راستہ خود منتخب کرنے کا اختیار نہیں ملا۔ وہ غیر نمائندہ حکمرانوں، مطلق العنان آمروں، سیاست پر قابض جاگیرداروں معیشت پر غاصب سرمایہ داروں کے تسلط رہے ہیں۔ ان کے سینے امریکی گولیوں کا نشانہ بھی بنے ہیں۔ اور تمہاری چینی لائٹ مشین گن سے نکلی ہوئی چینی گولیاں بھی ان کے سینوں میں پیوست ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ غیر ملکی حملہ آوروں کو تہس نہس کرنے کے لئے دی گئیں۔ آج ہم آدھا ملک گنوا بیٹھے ہیں۔ بھائیوں، محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں کے درمیان خود دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔ اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔ ہمارا قصور ہے تو اتنا کہ ہم اپنے جذبوں، ارادوں اور جدوجہد کو منظم نہیں کر سکے۔ ہمارے ہاں اب تک کوئی انقلابی پارٹی جنم نہیں لے سکی، ہمارے ہاں کسی انقلابی زمیندار نے چو این لائی بننے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے مزدوروں اور کسانوں نے بندوق نہیں اٹھائی۔ ہماری نوجوان لڑکیاں، رنگین ساڑھیاں، دلکش بیل باٹم ضرور پہنتی ہیں۔ مگر کسی نے فوجی وردی نہیں سجائی۔ ہمارا قصور ہے، تو صرف یہی۔

اے پیکنگ کے برف میں ڈھکے ہوئے کھیتو۔ الوداع۔ تمہارے محنت کشوں کو سلام۔

اب ہم ائرپورٹ پر پہنچ چکے ہیں۔ صدر بھٹو اور وزیر اعظم چو۔ این لائی گارڈ آف آنر کے معائنے کے لئے چلے گئے ہیں۔ ایئرپورٹ پر بھی وہی سماں ہے۔ وہی رنگ ہے۔ وہی لباس ہیں۔ میں طیارے کی طرف جا رہا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اتنے مختصر قیام کے بعد چلے جائیں، مگر کیا کریں۔

احفاظ اور ہاشمی بھاگتے ہوئے آئے ہیں۔ ان سے ایک الوداعی معانقہ کرتے ہیں۔ ایک تصویر بنواتے ہیں۔ یہ خوش قسمت لوگ ہیں، جو یہاں ۳ دن سے نہیں ۳ سال سے رہ رہے ہیں۔ ہم باتیں کر رہے ہیں۔ اتنی جلدی رخصت ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ صدر صاحب سب سے ملاقات کرنے کے بعد واپس آ رہے ہیں۔ سیکرٹری وزارت خارجہ مجھ سے کہتے ہیں "آپ کو چلنا نہیں ہے۔ چلئے سوار ہوں۔ وقت بہت کم ہے۔"

میں جہاز میں بیٹھ جاتا ہوں۔ جہاز سرد ہے ابھی حرارت پوری طرح پہنچائی نہیں جا سکی۔ خالی خزانے والی غریب قوم کی رنگین ساڑھیوں، چمکتے بدنوں اور لمبے بالوں والی ایئر ہوسٹسیں اس وقت اپنی یونیفارم میں ہیں ——— !

ہم پیکنگ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ پیکنگ کے تین بج رہے ہیں اور ہمارے بارہ ——— اب چھ گھنٹے بیس منٹ کا سفر درپیش ہے۔ پیکنگ جاتے وقت فاصلہ جلدی طے ہو جاتا ہے۔ پاکستان سے پیکنگ کی طرف جائیں تو ہوا موافق ملتی ہے جسے انگریزی میں TAIL WIND کہتے ہیں۔ مگر پیکنگ سے پاکستان کی طرف آئیں تو ہوا مخالف ملتی ہے اس لیے سوا ڈیڑھ گھنٹے کا فرق پڑ جاتا ہے۔

آتے ہوئے جذبات کا وہ عالم نہیں ہے۔ اس وقت اخبار نویسوں کو فکر ہے کہ مشترکہ اعلامیہ مل جائے تو اسے نقل کر لیا جائے ——— کچھ اور بریفنگ ہوتی ہے وہ ہو جائے تو پنڈی پہنچتے ہی اپنے اخبارات اور ایجنسیوں کو خبریں بھیج دی جائیں ——— راستے میں عزیز احمد سیکرٹری جنرل وزارت خارجہ ——— بریفنگ کرتے ہیں۔

جب ہم پنڈی پہنچتے ہیں تو رات اپنا دامن پھیلا رہی ہے۔ پنڈی ایئرپورٹ کراچی کی طرح روشن نہیں ہے۔ اندھیرے میں چھوٹا سا ہجوم استقبال کے لیے موجود ہے۔ اتنے اہم دورے کے بعد ——— اتنا معمولی سا استقبال ——— پاکستان پیپلز پارٹی کو کیا ہو گیا ہے ——— پاکستان کے عوام کو کیا ہو گیا ——— وزیر مشیر موجود ہیں۔

یہ خصوصی جہاز اب کراچی واپس جائے گا۔ ہم کراچی کے اخبار نویس اس جہاز سے فوراً کراچی چلے جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ رستے میں جہاز کے اندر خاصی تنہائی میسر آ جاتی ہے۔ میں اپنے دل اور دماغ میں امڈتے ہوئے جذبات کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کرتا ہوں۔

شعری اظہار اب ہو جائے ——— صحافیانہ اظہار پھر ہو جائے گا۔ ؏

تیرے چہرے پہ تبسم کی جھلک ہے پیہم
تیری آنکھوں میں چمک
ایسی چمک، جس سے سکوں ملتا ہے
تیرے ماتھے پہ خوشی
ایسی خوشی
جس میں کئی
خوابوں کی تعبیر کا احساس بھی ہے
اپنی منزل کو پہنچ جانے کی تسکین بھی ہے
ایک اک چہرہ کہ کھلتا ہے گلاب
اک نئے رنگ سے آتا ہے شباب
کوئی خواہش کا تلاطم نہ ہوس کا گرداب
ایک اک اینٹ کہ کھلتی ہے کتاب

ایک تاریخ کہ ہر گام پہ تحریر ہوئی
ایک اک لمحہ کہ صدیوں کو محیط
ہاتھ اپنے ہیں
جہاں اپنا ہے
عظمت اپنی
ہر قدم رنگ نیا، عزم نیا
ہر نظر خواہش نظارہ لیے
ہر جبیں پر نئے آفاق کی تسخیر کی بے تابی ہے
ایک تسکین ہے قریہ قریہ
ایک احساس ہے کوچہ کوچہ
اپنی منزل کا یقیں
اور بشارت ہو پہنچ جانے کی

تیرے چہرے پہ تبسم کی جھلک
تیری آنکھوں میں خوشی
میری خاطر، تیری گلیوں میں یہ رنگوں کے ہجوم۔
تیری آنکھوں میں خوشی مہکر رہے۔
میری آنکھوں میں ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں۔
ہم کہ حالات کے پابند ہیں۔
خواہش کے اسیر
ہم چمکتے ہوئے رنگوں کے غلام۔
کوئی منزل، نہ ارادہ، نہ بشارت، نہ یقیں
شاخ سے بچھڑے ہوئے پتے ہیں۔ آوارہ ہیں
ہاتھ اپنے ہیں،
لہو اپنا ہے،
ذلت اپنی

تیری آنکھوں میں خوشی،

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

شاہراہِ ریشم کے سبب چین اور پاکستان کی دوستی اٹوٹ ہوگئی

ایشیا کا دھڑکتا ہوا دل ـ سنکیانگ

قمر رضا جعفری

سنکیانگ اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے سبب ایک زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس کو ایشیا کا دل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ یہی وہ نکتہ ہے جس کے گرد ایشیا میں امریکی اور روسی اور چینی سیاستیں گھومتی ہیں سنکیانگ کو یہ سیاسی اہمیت صرف بیسویں صدی میں ہی حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کو یہ اہمیت تاریخ کے اسی ابتدائی دَور میں بھی حاصل تھی جبکہ انسانی قافلے اپنے جانوروں کے لیے چراگاہوں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہے تھے۔

سنکیانگ کی سرحدیں بیک وقت چھ ممالک سے ملتی ہیں اور یہی چیز اس کی سیاسی اہمیت بڑھانے کے لیے بہت کافی ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کے وسط میں ریگستان ہے اس کے شمال میں روس ہے۔ شمال مشرق میں منگولیا کے وسیع علاقے ہیں۔ اس کے مشرق میں چین ہے اور جنوب مشرق میں تبت ہے جنوب میں یہ ایک تنگ پہاڑی راستے کے ذریعے کشمیر سے ملتا ہے جنوب مغربی حصہ افغانستان کے پہاڑی سلسلوں سے منسلک ہے۔ سنکیانگ کا بیشتر حصہ ریگستان اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ آب و ہوا سرد اور خشک ہے۔ لیکن جہاں پانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ چند نخلستان ہیں جہاں خانہ بدوشوں کے قافلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے رہتے ہیں۔

تاریخ کے ابتدائی ایام میں جبکہ مختلف قوموں کے قافلے زرخیز چراگاہوں کی تلاش میں دنیا کے ایک حصہ سے دوسرے حصے میں منتقل ہو رہے تھے۔ سنکیانگ کو ایک گزرگاہ کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اسی دوران خانہ بدوشوں کا ایک بہت اہم راستہ جو کہ بحرِ اسود سے چین کے زرخیز میدانوں تک جاتا تھا، سنکیانگ کے وسط سے گزرتا تھا اسی راستے کے جنوبی حصوں میں کھیتی باڑی کرنے والے لوگ آباد ہو گئے۔ اس راستے کے شمالی خطے جو سائبیریا کے درمیان واقع تھے، نیم وحشی قبائل کا مسکن بن گئے اور درمیانی خطوں میں خانہ بدوش قبائل آباد ہو گئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس درمیانی خطے یا خانہ بدوشوں کے مسکن کو ایک طرح کے سیاسی مقیاس الحرارت کی سی حیثیت حاصل ہوگئی جس کے مختلف درجے، تجارت سیاست اور تمدن میں انقلابات کی پیشین گوئیاں کرتے ہوئے نظر آتے تھے ـــــ!

کچھ عرصہ کے بعد چین میں ہان خاندان کا عروج شروع ہو گیا۔ جس کی حدود بڑھتے بڑھتے وسطی ایشیا تک پہنچ گئیں جہاں ایسی سلطنت کی فوجوں کا مقابلہ یہاں کے خانہ بدوشوں اور دوسرے جنگجو قبائل سے ہُوا۔ چین اور قبائل کی کشمکش کا نتیجہ ایک مضبوط ہُن حکومت کی صورت میں رونما ہُوا جو کہ بہت جلد اپنی قوت اور دبدبے میں چین کی ہان سلطنت کا مقابلہ کرنے لگی۔ ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اپنے اثر و رسوخ کے لیے جد و جہد نے سنکیانگ کو ایک زبردست اہمیت کا حامل بنا دیا جس پر دونوں سلطنتیں اپنا اقتدار وسیع کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔

ہان اقتدار ختم ہونے کے بعد سنکیانگ صدیوں تک خانہ جنگیوں کا مرکز بنا رہا۔ اس کے شمالی حصے میں ارخان ترکوں کی حکومت قائم ہو گئی اور جنوب میں مختلف اقوام کے درمیان طاقت کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی لیکن چین میں ایک نئی طاقت یعنی ٹانگ خاندان کا عروج شروع ہو گیا جس نے کئی جنگوں میں ارخان ترکوں کو شکست دے کر ان کا علاقہ جنگیریا اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ٹانگ خاندان کو سنکیانگ کی سیاسی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سنکیانگ وسطی ایشیا پر اقتدار قائم کرنے کی کنجی ہے چنانچہ سنکیانگ پر اقتدار قائم کر کے ایک طرف تو چینی سلطنت کو ایرانی حملے کے خطرے سے بچایا جاسکتا ہے۔ اور دوسری طرف ہندوستان ایران اور بازنطینی سلطنت کی تجارتی شاہراہوں پر اقتدار قائم کر کے وہاں کی تجارت کا رُخ چین کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ سنکیانگ میں ٹانگ خاندان کے اقتدار کے دوران سنکیانگ میں جدید آلات سے لیس ایک زبردست فوج جس کی تعداد کبھی بھی پانچ لاکھ سے کم نہ ہوتی، وہاں ہر وقت متعین رہتی تھی۔ جس کے اخراجات کا یہ ملک اپنی اقتصادی بدحالی کے سبب کبھی بھی کفیل نہ ہو سکا ـــــ بہت جلد سنکیانگ میں چینی اقتدار ختم کرنے کے لیے بغاوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور بالآخر ۷۰۱ء میں تاشقند کے حکمران نے عربوں کی مدد سے چینیوں کو شکستِ فاش دی چینیوں کی اس شکست کے بعد وہاں کے باشندوں نے اس نئی داخل ہونے والی قوّت کو اپنا لیا۔ یہ نئی قوّت جس نے سنکیانگ میں بدھ مذہب، عیسائیت اور زرتشتی نظام کی خلیجوں کو پاٹ دیا، اسلام تھا مسلمانوں کے ہاتھوں چینیوں کی شکست کے بعد سنکیانگ بہت تیزی سے انقلابات کی منازل طے کرنے لگا۔ ترکوں کے اکثر خاندان جن میں سے قارنغ اور کرغیز خاص طور پر مشہور ہیں، یہاں داخل ہونے

ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے نپولین اور رُوس کے درمیان معاہدہ

لگے۔ سنکیانگ میں ترکوں کا داخلہ بے سبب نہ تھا، بلکہ تاریخی قوتیں ان سے وہی کام لے رہی تھیں جو کہ مختلف اوقات میں انسانی تہذیب و تمدن کے جمود کو دور کرنے کے لیے چراگاہوں کے خانہ بدوش کے شہریوں پر حملہ آور ہو کر تہذیب و تمدن کو نشاۃِ ثانیہ بخشنے کی صورت میں لیتی آئی ہیں۔

سنکیانگ پر مسلمانوں کا اقتدار زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ قناشیوں کے عروج و زوال کے بعد وسطی ایشیا سے چنگیز خان طوفان کی طرح اٹھا اور آندھی کی طرح پورے وسطی ایشیا پر چھا گیا۔ اسلامی سلطنتیں اس کے حملے کی تاب نہ لا سکیں۔ سنکیانگ بھی جو منگولوں کی سرحد کے نزدیک واقع تھا منگولوں کی تاخت و تاراج کا شکار ہو گیا۔ اس کی اہمیت چنگیز خان کی نظر میں یوں بھی زیادہ تھی کہ اس کی فتح کے بعد نہ صرف منگولیا ہی محفوظ ہو جاتا تھا بلکہ خوارزم پر حملے کے وقت یہ ایک فوجی اڈے کا کام بھی دے سکتا تھا۔

چنگیز خان کی سلطنت بہت جلد اس کی اولاد میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اس دوران میں چین میں منگ خاندان کی حکومت قائم ہو گئی اور انہوں نے اپنے ملک سے منگولوں کو نکال کر سنکیانگ کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن اس بار چینی فوجیں سنکیانگ کی سرحد سے آگے نہ بڑھیں۔ ایشیا کی دوسری مضبوط حکومتوں نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔ تاریخ ایک نئے انقلاب سے دو چار تھی جس کے سبب سنکیانگ اپنی اہمیت کھو بیٹھا تھا۔ یہ نیا انقلاب جس کے سبب سنکیانگ اپنی اہمیت کو کھو چکا تھا، بحری راستوں کی دریافت تھی۔

متمدن دنیا سے یک لخت تعلق ختم ہو جانے کے سبب صدیوں تک یہ ملک گمنامی میں پڑا رہا۔ کچھ عرصہ تک اس پر مغلوں کی حکومت رہی۔ مغلوں کے زوال کے بعد اس پر خوجے قابض ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد خوجوں کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس پر ایک غیر مسلم قوم یعنی کالمک نامی منگول قابض ہو گئے۔ اٹھارویں صدی کے ابتدائی ایام میں چین کے نئے حاکموں یعنی منچوؤں اور کالمکوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہو گئیں جو کہ بالآخر سنکیانگ پر منچوؤں کے مکمل اقتدار پر منتج ہوئیں۔

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی حالات ایک بار پھر پلٹا کھاتے ہیں اور اب ہمیں تین زبردست طاقتیں سنکیانگ کے محور کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہ طاقتیں ہیں چین، روس اور انگریز۔ ۱۸۰۷ء میں نپولین اور روس کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ دونوں فریق متحد ہو کر ایشیا کے راستے ہندوستان پر حملہ کریں گے۔ اس خبر سے انگریز بہت گھبرائے اور انہوں نے فوراً ایران، افغانستان اور رنجیت سنگھ کے پاس سیاسی مشن روانہ کیے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ وسطی ایشیا میں انگریزوں کی دلچسپی اس دَور سے ہی شروع ہوتی ہے۔

روس اور نپولین کی یہ دوستی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور ۱۸۱۹ء میں روس نے نپولین کو مکمل شکست دے دی۔ نپولین کی اس شکست کے بعد روس کی فوجی قوت سے بڑی بڑی طاقتیں کانپنے لگیں۔ اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر روس نے اپنی پرانی حکمت عملی پر عمل پیرا ہو کر بحرۂ روم کی طرف بڑھنا شروع کر دیا مگر بحرۂ روم کے راستے میں ترکی کی سلطنت حائل تھی اور روس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ترکی کی سلطنت کا شیرازہ منتشر کر کے بحرۂ روم کی کنجی یعنی درّہ دانیال پر قابض ہو جائے۔ ترکی کی سلطنت کا شیرازہ منتشر کرنے کے لیے روس نے بلقان کے لوگوں کو عیسائی مذہب کے نام پر ترکی کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ روس کی اس حکمت عملی کی آسٹریا اور برطانیہ کی حکومتیں بہت مخالف تھیں۔ آسٹریا کو خوف تھا کہ بلقان کی ریاستوں میں قوم پرستی کا جذبہ خود آسٹریا کی حکومت کے بلقان میں اقتدار اور اثر کے زوال کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اور دوئم آسٹریا کا بیشتر تجارتی سامان ڈینیوب کی وادی سے ہو کر گزرتا تھا اور اس لیے آسٹریا ڈینیوب کی وادی میں کسی دوسری طاقت کے اثر کو برداشت نہ کر سکتا تھا روس کی اس حکمت عملی کی برطانوی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ قسطنطنیہ پر روس کا اقتدار بحرۂ روم سے گزر کر ہندوستان جانے والی بحری شاہراہ کو بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔

انگریزوں کی مخالفت کا روس نے یہ حل تلاش کیا کہ وسطی ایشیا میں تیزی سے پیش قدمی کر کے تاشقند، خیوا اور بخارا کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے پیشِ نظر انگریزوں نے ایک طرف تو چینی حکومت کو امداد دے کر مضبوط کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف سنکیانگ کے مسلمانوں کو یعقوب خان کی سرکردگی میں روس کے خلاف ابھارا کیونکہ انگریزوں کے خیال میں روس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان کی سرحدوں پر ایک مضبوط اسلامی بلاک کی تشکیل میں مدد دی جائے لیکن روس کی سنکیانگ کی طرف پیش قدمی کے سبب یعقوب بیگ کی فوجیں میدان سے فرار ہو گئیں اور یعقوب بیگ نے خودکشی کر لی۔ انگریزوں نے روسی پیشقدمی کے پیشِ نظر گلگت کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے فرنٹیئر کے قبائلی سرداروں کو بھی اپنے زیر اثر لینے کی کوشش کی ——— ایشیا میں روس کے اقتدار کا سیلاب روکنے کے لیے انگریزوں نے جاپان سے بھی ایک معاہدہ کیا جس کی رَد سے انہوں نے جاپان کی روس سے جنگ کی صورت میں اپنی غیر جانبداری کا یقین دلایا۔ جاپان کے لیے انگریزوں کی یہ دوستی ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ مشرق بعید میں روس کا اقتدار جاپان کی ابھرتی ہوئی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ چنانچہ اس معاہدے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاپان نے فوراً ہی روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس جنگ میں روس کو شکستِ فاش ہوئی۔ اس شکست نے روس کے حوصلے پست کر دیئے اور روسی عوام نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی جس کو دبانے میں کافی وقت صَرف ہُوا۔

شکست کے بعد رُوس کو یورپ میں جرمنی اور آسٹریا سے خوف پیدا ہُوا کیونکہ یہ دونوں ممالک ترکی سے دوستی کر کے بلقان میں اپنا اثر و اقتدار وسیع کر رہے تھے چنانچہ جاپان کے ہاتھوں شکست اور جرمنی اور آسٹریا کے خوف نے روس کو مجبور کیا کہ وہ برطانیہ اور فرانس سے جرمنی اور آسٹریا کے خلاف ایک دفاعی معاہدہ میں منسلک ہو جائے چنانچہ روس اور برطانیہ کے درمیان دفاعی معاہدے کے سبب سنکیانگ ایک بار پھر اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔

۱۸۹۸ء میں امریکہ نے اسپین کو شکست دے کر فلپائن پر قبضہ کر لیا اور اب امریکہ کی عملی قوتیں ایشیا کی طرف متوجہ ہوئیں۔ امریکہ کو ایشیا کے وسیع معدنی ذخائر اور امریکی مصنوعات کی کھپت کے لیے ایک بڑی منڈی بننے کی

چین میں کمیونسٹ انقلاب کو روکنے کیلئے سامراجی ملکوں کا گٹھ جوڑ

صلاحیتوں کا احساس تھا مگر چونکہ امریکہ ایشیا میں دیر داخل ہوا تھا اس لیے یورپ کے سامراجی ممالک یہاں کے بیشتر حصوں پر قابض ہو کر ان کو اپنی مصنوعات کی منڈیوں میں تبدیل کر چکے تھے۔ چنانچہ امریکہ کے لیے ان پرانی سامراجی طاقتوں کے مقابلے میں ایک سامراجی طاقت کی حیثیت سے ایشیا میں داخلہ خطرات کا باعث بن سکتا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر امریکہ کی ایک درمیانہ پالیسی ہو گئی جس کو امریکہ کی "کھلا دروازہ پالیسی" کہتے ہیں۔ اور جس کا مطلب تھا کہ ایشیا کے باقی ماندہ علاقے خواہ کسی بھی سامراجی طاقت کے زیرِ اثر کیوں نہ آجائیں۔ اس طاقت کو اس ملک کے تجارتی دروازے ہر ملک کی مصنوعات کے لیے یکساں طور پر کھولنے پڑیں گے۔

ایشیا میں تجارتی دلچسپیوں کی بناء پر اب امریکہ کی یہ کوشش ہو گئی کہ روس کو بحرالکاہل، چین اور وسطی ایشیا کی طرف بڑھنے سے روکا جائے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد امریکہ میں یہ خیال بھی عام تھا کہ انگریزوں کی ایشیا میں زوال پذیر طاقت کے ضد کو امریکی طاقت سے پُر کرنا ضروری ہے ورنہ ایشیائی اقوام کی آزادی سامراجی ممالک کو منافع بخش منڈیوں سے محروم کر دے گی۔ سعودی عرب اور ایران میں امریکہ کی نظریں وہاں کے پٹرول پر تھیں۔ جبکہ چین میں وہاں کے خام مال پر!

چین اور مشرقِ بعید میں امریکہ کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کے سبب جاپان بہت گھبرایا اور اس لیے اس نے بحرالکاہل میں اپنی بحری قوّت کو بڑھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ پیش بندی کے طور پر جاپان نے چین پر حملہ کر دیا۔ جاپان کے چین پر حملہ سے امریکہ کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ چین پر جاپان کا اقتدار کہیں امریکہ کو چین کی زبردست تجارتی منڈی سے محروم نہ کر دے۔ چنانچہ امریکہ نے چین کی امداد کرنے کے لیے برما روڈ اور سنکیانگ کے راستوں کو منتخب کیا۔ چنانچہ امریکی امداد کے بل پر چینیوں نے قدم قدم پر جاپان کا منہ توڑ مقابلہ کرنا شروع کر دیا اور بالآخر جاپان یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ چین کی قوّت مدافعت ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ چین کو امداد پہنچانے والے راستے مسدود کر دیئے جائیں چنانچہ برما روڈ کو بند کروانے کے لیے انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے جاپانی سنکیانگ کی طرف بھی متوجہ ہوئے جاپان کا خیال تھا کہ منگولیا کے راستے سنکیانگ پر حملہ آور ہو کر نہ صرف چینی قوم پرستوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جا سکتا ہے بلکہ ہندوستان کی سرحد پر نقل و حرکت کر کے برما روڈ کو بند کروانے کے لیے انگریزوں پر بھی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سنکیانگ کو پراپیگنڈے کا اڈہ بنا کر مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو بھی امریکہ اور برطانیہ سے برگشتہ کیا جا سکتا ہے۔

امریکہ اور جاپان کی اس کشمکش کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں جاپان کو مکمل شکست ہوئی۔ اسی دوران برصغیر سے انگریزوں کا اقتدار بھی ختم ہو گیا اور اب امریکہ کو مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطیٰ میں اپنا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آنے لگا مگر جنگِ عظیم دوم میں جرمنی کی شکست کے بعد روس کی طاقت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اور اب روس نے مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطیٰ میں اپنا پرانا سیاسی کھیل شروع کر دیا۔

روس کی تائید و نصرت سے چینی کمیونسٹوں نے قوم پرستوں کو شکست دے کر چین پر قبضہ کر لیا جس سے گھبرا کر امریکہ نے کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے نیپال اور تبت کی حکومتوں سے ساز باز کر کے ان کو

> **انگریزوں نے روس کی**
> **پیش قدمی کے پیشِ نظر**
> **گلگت کو مضبوط کرنا**
> **شروع کر دیا**

کمیونزم کے خلاف دفاعی مورچہ بنانا چاہا۔ صرف یہی نہیں امریکہ نے ترقیات کے منصوبوں کی آڑ میں افغانستان ترکی اور ایران کو بھی کمیونسٹ سیلاب روکنے کے لیے ایک دیوار کی صورت میں کھڑا کرنا چاہا۔ امریکہ نے سنکیانگ میں بھی اپنا سفارت خانہ کھول کر اس کو اپنے زیرِ اثر لینا چاہا مگر اس سے پہلے کہ سنکیانگ میں امریکہ کی کوششیں کامیاب ہوں۔ وہاں کے لوگوں نے کمیونسٹ حکومت قائم کر لینے کا اعلان کر دیا۔

تبت کے کمیونسٹ حلقہ اثر میں آجانے کے بعد اب صرف کشمیر کا راستہ رہ جاتا ہے جو سنکیانگ کو غیر کمیونسٹ دنیا سے ملاتا ہے۔ اس راستے سے ہو کر کمیونسٹ ہندوستان یا پاکستان پر بہت آسانی سے وار کر سکتے ہیں اور اسی راستے سے روس کے قلب پر اور چین کے عقب پر وار کیا جا سکتا ہے۔ انہی اسباب کی بناء پر امریکہ کی یہ کوشش رہی ہے کہ اس راستے کی اجارہ داری ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک فریق کے سپرد نہ ہونے دے کیونکہ اس راستے کی اجارہ داری اس فریق کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دے گی۔

بین الاقوامی سطح پر گزشتہ بیس سالہ سیاسی تجربات نے پاکستانی عوام پر کشمیر اور سنکیانگ کو ملانے والے اس اہم راستے کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ شاہراہِ ریشم بن جانے کے بعد چین کی پاکستان کے پڑوسی اور عظیم دوست کی حیثیت سے بھی بے حد اہمیت بڑھ چکی ہے پاکستان کا چین عظیم ہمسایہ ہے اور جغرافیائی اعتبار سے ایشیا کا قائد! لیکن ایشیا کی بساطِ سیاست پر چین کا سب سے بڑا حریف بھارت ہے جو چین کی قیادت کا سب سے بڑا مخالف نظر آتا ہے۔

چنانچہ تبت، مشرقِ بعید، کشمیر، مشرقی پاکستان اور پاکستان کے خلاف بھارتی سازشیں دراصل چین کو ایشیا کی بساطِ سیاست پر مات دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ابتدا بھارت کی امریکہ سے ساز باز اور پھر روس سے فوجی معاہدے کی بنیاد پر پاکستان پر حملہ دراصل چین کی فوجی ناکہ بندی کی طرف ایک سوچا سمجھا قدم ہے۔ چنانچہ بھارت کا پاکستان کی سرحدوں خاص طور سے کشمیر کی سرحدوں میں تبدیلی کا مطالبہ بھارت کے ان ارادوں کی واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کیونکہ بھارت کشمیر اور سنکیانگ کے اس اہم راستے پر قابض ہو کر نہ صرف روس کی مدد سے چین کے عقب میں خطرات پیدا کرنا چاہتا ہے بلکہ پاکستان کی اس شہ رگ کو قطع کر کے پاکستان کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ بھارت کے جارحانہ عزائم کے پیشِ نظر پاکستان کے لیے اپنی سرحدوں پر کسی قسم کی تبدیلی قبول کر کے اس راستے کو بھارت کے سپرد کرنا پاکستان کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔

سفیرِ پاکستان نے

غسلخانے کی زیبائش پر ۲۷۰۰ پونڈ خرچ کئے

پرویز بشیر

پاکستان کو آجکل زبردست اقتصادی بحران کا سامنا ہے۔ ملک کا خزانہ زرِمبادلہ سے خالی ہو چکا ہے لیکن غیر ممالک میں پاکستان کا غیر ضروری سفارتی عملہ اس زرِمبادلہ کو جس کا ایک پونڈ اسٹرلنگ حاصل کرنے کے لیے قوم کو ۲۴ روپے کی قربانی دینا پڑتی ہے مختلف حیلوں بہانوں سے پانی کی طرح اپنی ذات پر خرچ کر رہا ہے۔ اس فضول خرچی کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، برطانیہ میں ہمارے ہائی کمشنر نے اپنے ذاتی غسلخانے اور باورچی خانے کی آرائش پر دو ہزار سات سو پونڈ سٹرلنگ کی رقم خرچ کی اور یہ رقم پاکستان کے خزانے سے حاصل کی گئی۔ پاکستان کے سفارت خانے میں اعلیٰ افسروں اور ان کے بچوں کو بیماری کی صورت میں ماہرینِ علاج سے رجوع کرنے کی آسانی ہے۔ اس سہولت سے جس طرح ناجائز فائدے اٹھائے جا رہے ہیں ان کی تفصیل انتہائی روح فرسا ہے۔ ایک ایک افسر تین تین طبی ماہرین سے رجوع کرتا ہے اور سینکڑوں پونڈ کا بل حکومت سے وصول کیا جاتا ہے ایسے افسران بھی موجود ہیں جن کی بیگمات کے میک اپ کا سامان بھی بعض پاکستانی ڈاکٹر خصوصی انجکشنوں کی مد میں شامل کر کے بل بنا دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ افسران جن کی صحت کی دیکھ بھال پر پاکستان جیسے غریب ملک پر اس قدر بوجھ ڈالا جائے۔ انہیں غیر ممالک میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں صرف ۱۹ اعلیٰ افسران ہیں۔ ان کی تنخواہیں، مکان کے کرایوں اور تفریحی الاؤنس کی مد پر حکومت کو ہر سال تقریباً ایک لاکھ پونڈ اسٹرلنگ کی رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔ سفارت خانے کے وہ دفاتر جو لندن کے علاوہ برطانیہ کے دوسرے شہروں میں ہیں۔ ان کے افسران کی تنخواہیں اس کے علاوہ ہیں، لیکن ان افسران کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ ہر پاکستانی کو ان سے شکایت ہے کہ جب بھی ملنے کے لیے جائیں تو "صاحب میٹنگ میں ہوتے ہیں" افسران کی اکثریت دفتری اوقات کا کوئی خیال نہیں رکھتی، ایک یا دو گھنٹے دیر سے آنا معمولی بات ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو پاکستانیوں کے مسلسل مطالبے پر بالآخر پاکستان ویلفیئر فنڈ کھولا گیا۔ پاکستانیوں نے مختلف ذرائع سے اس فنڈ میں رقم جمع کرائی۔ بہت سے پاکستانی خواتین و حضرات نے ذاتی طور پر ہائی کمیشن کی عمارت میں جا کر یہ رقوم جمع کراتے لیکن اس ضمن میں انہیں کیا دشواریاں پیش آئیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لیجئے۔

صبح کے دس بجے ہوں گے، دو بچیاں، پاکستان ہائی کمیشن کے دفترِ استقبالیہ میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ وجہ معلوم کی گئی تو پتہ چلا کہ صبح پونے ۹ بجے سے پاکستان کے دفاعی فنڈ میں چندہ دینے کے لیے بیٹھی ہیں لیکن کوئی فرد ان کی رہنمائی نہیں کرتا۔ مزید معلوم ہوا کہ جن حضرات کے ذمے یہ کام سونپا گیا ہے وہ ابھی تک تشریف ہی نہیں لائے۔

سفارت خانے کے وہ ملازمین جو پاکستان سے تبدیل ہو کر آئیں۔ انہیں فوری اخراجات کے لیے ڈیلی الاؤنس یا بھتہ دیا جاتا ہے اس رقم کا صحیح مصرف یہ ہے کہ متعلقہ فرد کی اس وقت تک مالی پریشانی نہ ہو جب تک کہ اس کی رہائش کا بندوبست نہ ہو جائے، عرصے تک یہ الاؤنس ۲۸ دن تک دیا جاتا رہا اور اپنی روایات کے مطابق ہمارے افسران نے اس رعایت کا جی کھول کر فائدہ اٹھایا۔ ہر ماہ اس مد میں ہزاروں پونڈ خرچ ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک محبِ وطن پاکستانی افسر نے جو ہیڈ آف چانسری تھے۔ ایک حکم جاری کیا کہ سات دن سے زائد ڈیلی الاؤنس نہ دیا جائے۔ موجودہ ہیڈ افسر چانسری کے آنے تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ان کے جانے کے بعد اس عہدے پر جو نئے صاحب آئے ہیں انہوں نے پھر سے یہ پابندی اٹھا دی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں خود ۲۸ دن کا بھتہ لینا تھا چنانچہ محض ایک افسر کی خاطر ہزاروں پونڈ کی رقم اس تمام عملے کو دینا پڑی جنہیں صرف سات دن کے حساب سے بھتہ دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دھاندلی یہ ملاحظہ فرمائیں کہ ایسے تمام عملے کو حکم دیا گیا کہ ۲۸ دن تک انہوں نے جو فارن الاؤنس یا مکان کا کرایہ لیا ہے اسے واپس دے کر بھتہ حاصل کریں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن "الفتح" کے لئے لکھیں

پاکستان پیپلز پارٹی اپنے کارکنوں اور عوام کے تعاون سے برسرِ اقتدار آگئی ہے۔ اقتدار کے حصول کے بعد اس کے کارکنوں کا کیا کردار ہے۔ ان کے اور ان کے رہنماؤں کے درمیان کیا رابطہ ہے۔ یہ سب کچھ کارکنوں کی زبانی جاننے کے لئے ہم یہ سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے کارکن منظم اور مضبوط ہو کر وطن دشمنوں پارٹی دشمنوں اور پارٹی کے منشور سے غداری کرنیوالوں کا مقابلہ کر سکیں۔ تمام کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں نیچے کچھ سوالات دیئے گئے ہیں۔ کارکن ان کے جواب ہمیں تفصیلاً لکھ کر بھیجیں۔ اس کے ساتھ اپنی (۱) تصویر (۲) کارڈ نمبر، (۳) پارٹی یونٹ اور (۴) یونٹ بھی لکھ کر بھیجیں۔ سوالات یہ ہیں۔

(۱) پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد آپ کا پارٹی کے کردار کے بارے میں پہلا تاثر کیا ہے؟

(۲) عوام نے پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، ان کے پورے ہونے کے کیا امکانات ہیں؟

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان کوئی ربط باقی ہے یا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا کارکنوں سے کیا رویہ ہے۔

(۵) کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کے لئے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہے۔

(۶) پیپلز پارٹی کے بااثر افراد نے مختلف ذرائع سے کمائی شروع کر دی ہے۔ کیا آپ کے علاقے میں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے ہیں۔

(۷) آپ کے خیال میں حکومت کو پارٹی پر کنٹرول کرنا چاہیئے یا پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

(۸) عام تاثر یہ ہے کہ آپ لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں یہ کہاں تک درست ہے۔؟

ریڈیو پاکستان کراچی - پردہ چاک

یہاں صرف نااہل افراد کی پرورش کی جاتی ہے

بدعنوانیاں اور سازشیں ریڈیو اسٹیشن کا مقدر بن چکی ہیں

ایس - طلعت رؤف

دورِ سیاہ کی تاریکیوں کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ اس اجالے کی بہت بھاری قیمت اس ملک و قوم کو ادا کرنی پڑی ہے۔ اب ہمارا اپنا فرض ہے کہ اپنے ملک و قوم کی تعمیرِ نو اور فلاح و بہبود کے لئے مسلسل محنت، بھرپور جد و جہد و تندہی سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس گلشنِ وطن کی از سرِ نو تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور اس مملکت خداداد کو دنیا کی ایک عظیم اور مثالی مملکت بنانے میں اپنی تمام بہترین کوششوں کو صرف کر دیں۔ ملک کے ہر شعبۂ زندگی میں نئے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ملک و قوم اور معاشرہ کے دشمن افراد کی صفوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ نوکر شاہی کو اپنا وجود خطرہ میں نظر آ رہا ہے۔ بگڑے ہوئے افسران کا آسانی کے ساتھ نیک بن جانا مشکل امر ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ناسورِ وطن۔ مصلحتاً اپنا روپ شاید بدل بھی لیں لیکن اپنی فطرتِ ثانیہ کو اتنا جلد بدل لینا اب خود ان کے اختیار میں نہیں رہا ہے۔ افسران کا اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانا، حصولِ رشوت، اقربا پروری اور خوشامدی افراد سے جوڑ توڑ ہی کچھ ہمارے بیشتر سرکاری افسران کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اب اِس قسم کے افسرانِ اعلیٰ کا وجود نہ صرف انتظامیہ پر بلکہ ملک و قوم کے لئے بھی ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔ اب اس عمل و کردار کے حامل افسران کا وجود برداشت کیا جانا..... ناممکن ہے..... اِن بدکردار و بداعمال افسران کا ٹولہ اور ان کے کارندے ہر جگہ، ہر محکمہ میں موجود ہیں اور آج بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروفِ کار ہیں۔ قومی و سرکاری محکموں میں، قومی اہمیت کا سب سے بڑا ادارہ ریڈیو بھی ہے۔ جو حکومت کے زیرِ انتظام قوم کی آواز بن کر اندرون و بیرونِ ملک ہماری سوچ، اندازِ فکر اور فنونِ لطیفہ کے اسلوب کار کے ساتھ ساتھ، ہمارے عمل و کردار، تہذیب و اخلاق غرض ہر گوشۂ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے، اس لئے ریڈیو کو قومی امنگوں کا ترجمان اور اپنے عوام کی آواز کہا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا ریڈیو بدنصیبی سے۔ کسی بھی اعتبار سے نہ عوام کا کہا گیا ہے۔ اور نہ ہی اِس کا کوئی رشتہ عوام سے رکھا گیا ہے۔ ریڈیو کے ادارہ میں آج تک وہی کچھ ہوتا رہا ہے، جو ملک کے بدعنوان نوکر شاہی کے کارندے چاہتے تھے۔ نوکر شاہی نے اس قومی و سرکاری ادارہ پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، اور اِس ناجائز اجارہ داری اور بدعنوانی کی جب بھی کسی کی طرف سے نکتہ چینی کی گئی تو ریڈیو کے حکام نے اسے اپنی انتقامانہ سرگرمیوں کا نشانہ بنایا۔ کراچی کے ریڈیو اسٹیشن کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ بدعنوانیاں اور سازشیں اس ریڈیو اسٹیشن کا مقدر بن چکی ہیں جن سے اب ریڈیو سے غیر متعلق عام لوگ بھی واقف ہو چکے ہیں یہاں صلاحیت و قابلیت کو پسِ پشت ڈال کر محض اپنے مفاد کے لئے کام کیا جاتا رہا ہے۔ بدعنوانیوں اور اقربا پروری کی اتنی تلخ مثالیں کسی دوسرے محکمہ میں شاید کم ہی ملیں گی۔ اگر اس ادارہ سے متعلق بے شمار حقیقتیں افشاں کر دی جائیں تو وہ اس قومی ادارہ کی ساکھ اور وقار کے لئے ایک بدنما داغ بن کر ہی سامنے نہیں آئیں گی، بلکہ اس خوب صورت پردہ کے پیچھے سے مکر و فریب کی وہ تصویریں سامنے آئیں گی جو بھیانک بھی ہوں گی، آئے دن ناجائز ہتھکنڈوں کے ذریعہ، اپنے لوگوں کو ریڈیو پر مسلط کیا جاتا رہا ہے اور اس طرح محض اپنے من پسند نااہل افراد کی مسلسل پرورش کی جاتی رہی۔ خوبصورت نقابوں میں کتنے بہت سے بھیانک چہرے پوشیدہ ہیں۔ یہ خوش نما چہرے۔ یہ بدعنوان افسران کیا اِس دورِ انقلاب کے بعد بھی ریڈیو پر اپنی من مانی کرتے ہوئے یوں ہی مسلط رکھے جائیں گے؟ آج جب کہ ملک سے تاریکیوں کے سائے چھٹ رہے ہیں تو ملک و قوم کے اس قومی و سرکاری ادارہ کی بدعنوانیوں کی طویل رات کو بھی ختم ہو جانا چاہیئے۔ ناانصافی۔ بدعنوانی و عیاشی کے ان تمام راستوں کو اب مقفل کرنا ہو گا۔ ریڈیو کو۔ اب حقیقتاً قومی و سرکاری ادارہ ہونے کی حیثیت سے کچھ واضح اصول اور ضابطے وضع کرنے ہوں گے۔ جن کا وجود محض دفتری فائلوں تک محدود نہ رکھا جائے گا بلکہ ان پر سختی سے عمل بھی کیا جانا چاہیئے۔

ریڈیو بدعنوان افسران کی سب سے بڑی آماجگاہ ہے۔ یہاں بدعنوانیاں اور دھاندلیاں عام ہیں۔ ان شعبوں کے ہر سربراہ نے اپنے اپنے شعبوں میں اپنی پوری پوری ناجائز حاکمیت قائم کر رکھی ہے۔ ان شعبوں کے حاکم جنہیں ریڈیو کی زبان میں پروگرام آرگنائزر اور پروگرام پروڈیوسر۔ کہا جاتا ہے اپنے اپنے شعبوں میں بدعنوانیوں اور اقربا پروری کو دیدہ دلیری سے جنم دیے ہوئے ہیں۔ یہ وہ صنف ہے، جو فن کاروں کی فنی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے میں قطعی بااختیار سمجھی جاتی ہے۔ یہ بدعنوان افسران اپنے قریب ایسے افراد کو پھٹکنے ہی نہیں دیتے جو ان کی خوشامدانہ فطرت و عادت کو تسکین نہ پہنچا سکے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو معمولی اور غریب فن کاروں سے چائے اور سگریٹ جیسی چیزوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ اگر کوئی خوددار فن کار اُن کی فطرت و عادت اور ناجائز مطالبہ کو مسترد کر دے تو۔ گویا۔ اس کے مقدر میں ریڈیو کی ٹھوکریں ہی لکھ دی جاتی ہیں۔ اختیارات کا ناجائز استعمال۔ آپس کے جوڑ توڑ۔ باہمی رقابتیں۔ یہاں روز کا معمول بن چکی ہیں۔ پروڈیوسروں کی یہ بدعنوانیاں اور غیر ذمہ داریاں اب آرٹ کے مخصوص شعبوں سے نکل کر دوسرے شعبۂ اختیار میں بھی تیزی سے پہنچنے لگی ہیں۔ ۳، فروری ۱۹۷۱ء کو نیوز ریڈر کی آسامی کے لئے آواز کے امتحان کا فائنل آڈیشن لیا گیا۔ ایک اطلاع کے مطابق کئی ماہ تک ان آڈیشنز کی ٹیپ ریکارڈنگ حکامِ اعلیٰ

شعبہ ڈرامہ میں سالہا سال سے چند صداکاروں کی اجارہ داری قائم ہے

نہ سُن سکے۔ اور انتخاب کا مسئلہ زیرِ غور رہا۔ کہ فیصلہ کس افسر کے حق میں کیا جائے۔ لہٰذا پھر طویل جوڑ توڑ کے بعد قابلیت وصلاحیت کو کئی مرحلوں سے گزارے بغیر ہی افسران نے اپنے اپنے مخصوص امیدوار منتخب کرلئے۔ اور وہ بدنصیب یا خوش نصیب امیدوار جو سلیکشن کے لئے آڈیشن کے اس معرکہ میں شریک تھے۔ تقریباً سال بھر تک زحمتِ انتظار میں مبتلا رہے کہ شاید انہیں اس کامیابی یا ناکامی کی کوئی اطلاع ریڈیو کے حکام سے مل جائے۔ آڈیشنز کے یہ تکلفانہ سلسلے ڈرامہ۔ میوزک۔ اناؤنسمنٹ اور دیگر حصولِ فن کے لئے ریڈیو کے مائک تک پہونچنے کے لئے امیدوار فن کاروں کے لئے آزمائش کا سب سے بڑا امتحان کہلاتے ہیں۔ یہ ریڈیو کا روز کا معمول بنے ہوئے ہیں۔ جو اب مبتدی صلاحیتوں کے لئے مستقل دردِ سر بن چکے ہیں۔ جن کا کوئی معیار۔ کوئی اصول کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ اِس لئے اِن آڈیشنز کے سلسلوں کا مصرف بے مقصد و بے عمل بن کر رہ گیا ہے۔ اگر ان آڈیشنز کو محض فریب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اِن آڈیشنز میں شریک کوئی امیدوار اگر اپنی مسلسل محنت اور سالہا سال کی سر توڑ کوششوں اور جد وجہد کے بعد آڈیشن کے اِس اذیت ناک معرکہ و مرحلہ سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو جائے تو پھر ریڈیو پر اپنے لئے کوئی پروگرام حاصل کر لینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ گویا یہ نئے فنکاروں کی دسترس سے باہر ہی سمجھا جاتا ہے۔ اسے اس وقت تک کوئی کامیابی میسر نہیں ہوتی تا وقتیکہ وہ پروگرام آرگنائزر اور پروگرام پروڈیوسرز کی جوتیاں سیدھی کرنے کے علم و ہنر سے پوری طرح واقف نہ ہو جائے۔

شعبۂ فنِ ڈرامہ سے وابستہ چند مقبول و معروف آوازیں سال ہا سال سے ذہنوں پر مسلط ہیں۔ ہم ان کی ہنرمندی اور صلاحیتوں کے ہرگز منکر نہیں۔ لیکن ان آوازوں کی ریڈیو پر مسلسل اجارہ داری کے قطعی مخالف ہیں، جس کے سبب فن محض اِن ہی کی میراث بن کر رہ گیا ہے۔ اور دوسری طرف قابلِ افسوس بات یہ کہ بے شمار فن کاروں کی حق تلفی ہوتی رہی ہے۔ ریڈیو کی یہ مقبول آوازیں جن کے حصول کے لئے عموماً پروگرام پروڈیوسران بھی ان کے محتاج نظر آتے ہیں محض اِس لئے کہ ان فن کاروں کے حصول اور تعاون کے بعد یہ نام نہاد پروڈیوسران اپنی کارکردگی وصلاحیت کا بھرم رکھیں۔ ریڈیو کے حکام نے کبھی اس حقیقت کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ ان پرانے اجارہ دار فن کاروں کے بعد کیا ہوگا۔ ؟ ایسا تو نہیں کہ اس عظیم شہر میں صلاحیتوں کی کمی اور قابلیت کا فقدان ہو۔ جب کہ یہ وہ شہر ہے جس نے ملک کے ہر شعبۂ فن میں عظیم و نامور فن کار پیدا کئے ہیں۔ ——— پروڈیوسران کے پاس حقیقت کا کوئی جواب ہے کہ انہوں نے کتنے نئے صداکاروں کو گزشتہ طویل عرصے میں ریڈیو سے روشناس کرا کے ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور انہیں اپنی محنت و جانفشانی سے مقبول بنانے میں معاون بنے۔ ؟

شعبۂ ڈرامہ میں ایک ایسے نام نہاد فرد بھی ہیں جو اپنے آپ کو فن ڈرامہ کا باوا آدم سمجھتے ہیں اور ہمارے ریڈیو کے حکام کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ان کی اِس خوش فہمی پر اندھا ایمان بھی لے آئے ہیں۔ ڈرامہ کا شعبہ ان کے دائرۂ اختیار میں دیدیا گیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ یہ نام نہاد پروڈیوسر اور شعبۂ ڈرامہ ایک طویل عرصہ سے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ نتیجہ میں اس شعبہ میں مکمل طور پر ان کی اجارہ داری و حاکمیت قائم ہو چکی ہے۔ وہ اپنی بدعنوانیوں کو جس طرح چاہتے ہیں بروئے کار لاتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں۔ قصیدہ گو افراد ان کے آگے پیچھے واہ واہ کی صدائیں بلند کر کے انہیں عظیم سے عظیم تر ماہرِ فن ثابت کئے ہوئے ہیں۔ ریڈیو کی ایسی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان بدعنوان، غیر ذمہ دار، نااہل افراد کا ان تمام شعبوں میں عمل و دخل اور مستقلاً اجارہ داری و حاکمیت ایک طویل عرصہ سے قائم ہے۔ جو نہ صرف اس قومی و سرکاری ادارہ کے وقار کو نقصان پہنچاتی رہی ہے۔ بلکہ ریڈیو کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے۔ اِن تمام متعلقہ حکام اور پروڈیوسروں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ نئے تجربات کریں۔ اور نئی صلاحیتوں پر محنت کر کے انہیں سامنے لانے میں اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو دیانت داری سے پورا کریں۔ اقرباء پروری، خوشامد، گھٹیا سیاست اور باہمی رقابتوں کا اب ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہونا چاہیئے۔ جو اب ایک ناگزیر ضرورت بن چکا ہے۔

جس طرح سالہا سال سے چند صداکاروں کو ریڈیو پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ کم و بیش یہی صورتِ حال بہت سے قلم کاروں کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ ایسے قلمکار جنہیں ریڈیو نے بے حد نوازا ہے۔ محض چند بدعنوان افسرانِ اعلیٰ کی کرم فرمائی کی بدولت ریڈیو پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان قلم کاروں میں کچھ اہلِ قلم حضرات تو محض فنِ ترجمہ نویسی ہی کے سہارے ریڈیو پر اپنی ڈرامہ نویسی کی دھاک بٹھائے ہوئے ہیں۔ بیرونی ادب و ڈرامہ کے ترجمے و سرقے کرنا ہی ان ڈرامہ نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور اس سلسلہ میں ریڈیو کے اعلیٰ حکام کی نظرِ عنایت، رہبری، شفقت و پسندیدگی ان سرقہ نویسوں کو حاصل رہی ہے۔ مانگے ہوئے ڈرامے۔ چرائے ہوئے خیالات اور بیرونی ادب کو ہم کب تک اپنا مشقِ قلم بناتے رہیں گے۔ کیا ہمارے پاس اپنے قومی، ملکی، معاشرتی و گھریلو مسائل کچھ کم ہیں۔ جو ہم ان حقیقتوں سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتے۔ کیا ان نام نہاد ڈرامہ نگاروں کے لئے کوئی اوریجنل تخلیق سپردِ قلم کرنا ان کی صلاحیتوں کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ آخر کب تک ہم ان ملشوں کے ذریعے بیرونی خیالات کو اپنا اُترا اُترا لبادہ پہنا کر اِس فن پر اپنا سر دھنتے رہیں گے۔

ادیب تو احساس کا ترجمان ہوتا ہے۔ اپنی حقیقتوں کا پاسبان، لیکن اگر سرقہ نویسی ہی کو اپنا شعار بنا لیا جائے تو حالات برعکس ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ تلخ سبب جس کے زیرِ اثر دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ ہمارے ریڈیو کا کوئی ڈرامہ نگار جب اِس پُرفریب چہار دیواری سے نکل کر فلم تک پہنچتا ہے تو وہ عام طور پر چربہ نویسی کا شغل ہی اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک تازہ مثال حال ہی میں سامنے آچکی ہے کہ کہانی نویس نہ صرف یہ کہ خود بُری طرح ناکام رہا بلکہ اُس نے ایک اچھے ہدایت کار اور بڑے مقبول اداکاروں سمیت، ایک بڑی فلم کا اپنی ناپختہ ذہنی تخلیق کی آزمائش میں بیڑا غرق کر دیا۔ اور کل کا وہ کامیاب ہدایت کار آج اپنی قسمت کو روتا پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ قلم کار یہی کر سکتا تھا۔ ایک طویل عرصے تک محض سرقہ نویسی کرتے کرتے اس کی اپنی ذہنی سوچ کی قوتیں کہیں گم ہو چکی ہوتی ہے۔ دوسروں کی سوچوں کو نقل کر دینا سہل نگاری ضرور کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ فعل کسی بھی صورت میں قابلِ تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ ریڈیو کے سامعین اِس حقیقت کو سمجھنے میں آج تک قاصر ہی رہے ہیں۔ کہ اس میں آخر کون سی دانشمندی پوشیدہ رہی ہے۔ یہ ریڈیو کے بقراطوں کی عقل مندی ہے یا ترجمہ نویسی۔ قلم کاروں کی قابلیت وصلاحیت کا کمال، اس حقیقت پر تو وہی لوگ کچھ روشنی ڈال سکیں گے۔ اب دورِ نو کے موجودہ تقاضوں کو دیکھتے ہوئے ریڈیو کے باشعور حکام کو اس غلط اور افسوس ناک روش کو ترک کر دینا چاہیئے جس پر وہ آج تک عمل کرتے رہے ہیں۔ ہمارے پاس کیا کچھ

ریڈیو کے کہانی نویس نے ایک ممتاز ہدایتکار کی فلم کا بیڑا غرق کر دیا

نہیں۔ اِس ملک کی مٹی بڑی زرخیز ہے۔ بس ذرا سمجھنے والی عقل اور دیکھنے والی نگاہ کی ضرورت ہے۔ اگر ریڈیو کے یہ اعلیٰ حکام جو اپنی چہار دیواری میں مقید ہیں طبعزاد خیالات پر مبنی نئی راہیں قلم کاروں سے تخلیق کروائیں تو یہ ایسا ناممکن تو نہیں جس پر عمل درآمد نہ کیا جا سکتا ہو۔ انہیں اب سوچنا چاہیئے کہ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اور وہ ادیب جسے اپنے خیالات، احساسات و نظریات کا پیامبر کہا جاتا ہے۔ یہاں اپنے ضمیر کو روپیہ کی ہوس میں فروخت کرتا رہا ہے۔ وُہ حکام اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے قلم کو خوشامدانہ روش پر استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ دس سالہ ایوب دورِ آمریت میں یہی قلم کار اس کے ہر فعل پر واہ واہ کے ڈونگرے برساتا رہا۔ یحیٰ تشریف لائے تو یہی ادیب پہلے کی بُرائی کر کے۔ اب اس دورِ حکومت کی قصیدہ گوئی میں مصروف ہو گیا۔ ادب و زبان کے سارے آداب بالائے طاق رکھ کر یحیٰ کے لئے گرج چمک پیدا کرتا رہا اور ریڈیو کے حکام اس پر اپنی شفقت و پسندیدگی کے پھول برساتے رہے اور جب آمریت کا دورِ سیاہ اپنے اختتام کو پہنچا تو یہی ڈرامہ نویس اب اپنے ڈرامہ میں ایک نئی بات پیدا کر چکا تھا۔ جو اس سے بیشتر پچھلے ادوار میں پیش کی جاتی رہی تھی۔ خیالات کا رخ ایک بار پھر پھر گیا۔ بات کا انداز بدل گیا۔ اور نئی حکومت کی قصیدہ گوئی شروع کر دی گئی۔ عوامی رہنما پر عقیدت کے پھول نچھاور ہونے لگے۔ یہ سب کیا ہے۔ ایک ادیب کی شان یا اس کا ذہنی دیوالیہ پن۔ یا پھر خوشامدانہ ذہنیت کی علامت۔ یہ کسی صاحبِ قلم کا طرۂ امتیاز تو نہیں۔

حکومت اور ملک کو جہاں بہت سے دیگر بیرونی خطرات کا سامنا ہوتا ہے، وہاں ملک اور حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں ایک اندرونی خطرہ بھی اپنا خطرناک کردار ادا کرتا ہے۔ اور وہ ہے قصیدہ گوئی۔ قصیدہ گو شاعروں اور ادیبوں کا یہ گروہ حکومت کو کبھی صحیح صورت حال کا علم نہیں ہونے دیتا۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کا وہ طبقہ ہے جو ہر دورِ حکومت میں اپنا خطرناک کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ایسے عادی قلم کاروں سے ریڈیو کے قومی ادارے کو محفوظ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ جن کے اپنے کوئی نظریات نہیں۔ اپنے ضمیر کی کوئی آواز نہیں۔ جو ہوا کے ساتھ اپنا رُخ بدل لیتے ہیں۔

ریڈیو کے کچھ پروڈیوسران اور آرگنائزر حضرات کو ایک بیماری اور لاحق رہی ہے۔ جو آج بھی پھل پھول رہی ہے۔ یہ بیماری وہ شوق ہے۔ جس کے سبب ریڈیو کے آرگنائزر اور پروڈیوسر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لئے لکھنے لکھانے کا شغل بھی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس تکمیلِ شوق کے لئے وہ مستحق اہل کاروں کی حق تلفی کر کے مجرمانہ ذہنیت کی داغ بیل ڈالے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ان حضرات کے لکھنے لکھانے کے شوق و شغل کا تعلق ہے۔ وہ اپنی جگہ درست۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شوق مستحق لوگوں کے لئے ایک رکاوٹ بن جائے تو حالات یقیناً قابلِ رحم ہو جاتے ہیں۔

ان ناگفتہ بہ حالات اور تلخ حقائق کے زیرِ اثر نہ جانے کتنی بہت سی فنی صلاحیتوں کو بدعنوانیوں اور لاقانونیت کی بھینٹ چڑھایا جاتا رہا ہے۔ ریڈیو جو قومی و سرکاری اہمیت و وقار کا سنگ میل ہوا کرتا ہے۔ ایک طویل عرصہ سے غلط طرزِ عمل رکھنے والے حاکموں کے سبب ذاتی اغراض۔ اقرباء پروری، مصلحت بینی اور سنگین بدعنوانیوں کا ایک مرکز بنا ہوا ہے۔

بہر حال سنگین ذ تاریک دورِ آمریت اب ختم ہو چکا ہے۔ عوام کی اپنی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اب رائے عامہ کا تقاضہ یہ ہے کہ۔ ریڈیو کے محکمہ میں اب تک جو سنگین بدعنوانیاں جاری رہی ہیں انہیں فوراً ختم ہونا چاہیئے۔ ایسے بدعنوان افراد جو ریڈیو کو اپنے ناپاک عزائم کے تقاضوں کے تحت مجروح کرتے رہے ہیں۔ ان افراد کے خلاف سختی سے انکوائری کی جائے اور مجرم پائے جانے والے کسی بھی فرد کو خواہ وہ ریڈیو کے اعلیٰ عہدہ پر ہی فائز کیوں نہ ہو۔ اس ادارہ سے برخاست کیا جائے۔ ریڈیو کے ادارہ کو بدعنوانیوں اور لاقانونیت سے پاک رکھنے کے لئے سخت احکامات جاری کئے جائیں اور ان پر سختی سے عمل بھی کرایا جائے۔

توپ خانے اور طیار

دشمن آگے نہ



صدر ماؤ مسکرائے ——— "مَیں نے برفپوش پہاڑ بھی پار کیے ہیں اور خارزار میدانوں سے بھی گزرا ہوں ۔ لیکن میں نے کبھی کسی ریگستان میں قدم نہیں رکھا۔ گھبراؤ نہیں ہم وہ کام نہیں کریں گے جو دشمن چاہتا ہے ۔ وہ ہمیں دریائے زرد کے اس پار دھکیلنا چاہتے ہیں ۔ لیکن ہم اس کے برعکس قدم اٹھائیں گے ——— مغرب کی طرف مارچ کریں گے ۔ وہاں بے شمار سڑکیں ہیں ۔ آخر ریگستان عبور کرنے میں کیا دھرا ہے ۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے اور حالات کا جائزہ لینا چاہیئے ۔ اس کے بعد بھی ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ ہم ہوزونگ نان کی فوجوں کے آنے سے پہلے یہاں سے رخصت ہو جائیں"

"جناب صدر ، آپ پہلے چلے جائیں ۔ میں یہاں آپ کی جگہ رکوں گا اور دشمن سے لڑ کر اسے روک کے رکھوں گا ، دیکھوں وہ کتنے زور میں ہے ۔ اس کے بعد ہم آپ کو رپورٹ دیں گے "۔ کامریڈ وانگ تنگ تشنگ صدر ماؤ کے خیالات کو پڑھنے میں مہارت رکھتے تھے ۔ صدر ماؤ شاید اس لیے وہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ حملہ آور دشمن پر ضرب لگانا چاہتے تھے ۔ تاکہ عوام کو وہاں سے ہٹنے کے لیے آڑ بھی مل جائے اور دشمن کو ہماری اصل قوت کا اندازہ بھی نہ ہو سکے ۔ صدر ماؤ نے کامریڈ وانگ تنگ تشنگ کی بات سنی تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے ——— "کیا تم میں یہاں رکنے کا حوصلہ ہے ؟"

کامریڈ وانگ تنگ تشنگ ہنس پڑے ——— "کیوں نہیں ؟ بس جناب صدر کے حکم کی دیر ہے !"

"اچھا ! تمہیں کتنے آدمیوں کی ضرورت ہو گی ؟" صدر ماؤ نے پوچھا ۔

"مجھے ایک پلاٹون دے دیجئے "۔

"اچھا ، ہم تمہارے پاس ایک پلاٹون چھوڑے دیتے ہیں ، پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ دشمن کو یہاں روکے رکھنا "۔

حکم پاتے ہی کامریڈ وانگ نے تیاریاں شروع کر دیں ۔ صدر ماؤ نے دوبارہ صحن کا چکر لگایا ۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ غار نما مکان جہاں وہ تقریباً دو ماہ سے قیام پذیر تھے ان کے جذبات کی دھڑکنیں سن رہا تھا ۔ صدر ماؤ اپنا سر جھکائے ہوئے تھوڑی دیر تک کچھ سوچتے رہے پھر وہ ہماری طرف مڑے اور بولے

"غار کو اچھی طرح صاف کر دو اور یہاں کی ہر چیز دوبارہ احتیاط کے ساتھ اس کی اصل جگہ پر رکھ دو "۔

آسمان بالکل تاریک ہو چکا تھا ۔ ہم نے ایک لالٹین جلا لی ۔ جب تک تمام ایڈر تیار ہو کر گھوڑوں پر سوار ہوتے اچانک بوندا باندی ہونے لگی ۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب ہم بارش سے نہیں بچ سکتے تھے ۔

احاطے سے باہر نکلنے سے پہلے صدر ماؤ بوڑھے وانگ کے غار نما مکان کے دروازے کے باہر ذرا سی دیر کے لیے رکے اور انہوں نے پوچھا ——— "کیا ہمارا میزبان اب بھی یہیں ہے ؟" مَیں نے جواب دیا ——— "گاؤں کے کارکن پہلے ہی تمام لوگوں کو یہاں سے لے جا چکے ہیں "۔ تب کہیں جا کر صدر ماؤ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے ۔

ہم گاؤں کے عقبی حصے کی طرف بڑھے اور اس کے بعد وہاں سے مغرب کی طرف ایک پہاڑ پر چڑھنے لگے ۔ بوندا باندی ہو رہی تھی ۔ حالانکہ یہ جون کا مہینہ تھا لیکن اس اندھیری رات میں اس بوندا باندی کی وجہ سے موسم میں قدرے خنکی پیدا ہو گئی تھی ۔ جوں جوں ہم چوٹی کے قریب پہنچتے گئے ۔ ہوا کا زور بڑھتا گیا اور بارش شدید ہوتی گئی ۔ ہمارے لیڈروں نے برساتیاں پہن رکھی تھیں اور گھوڑوں پر سوار تھے لیکن ان کے پتلون گھٹنوں سے نیچے پانی میں شرابور ہو چکے تھے ۔ وانگ چھن ہائے جو صدر ماؤ کے گھوڑے کی رکاب تھامے ہوئے تھا پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا وہ راستے میں پڑے ہوئے پتھروں کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتا کہ کہیں گھوڑے کا پاؤں نہ پھسل جائے ۔ جب کبھی پھسلواں زمین آتی تو وہ بار بار گھوڑے کو چمکارنے لگتا ۔ جیسے وہ اس سیاہ بوڑھے گھوڑے سے کہہ رہا ہو "ذرا سنبھل کے "۔ جب کوئی ڈھلان آتی تو وہ مدھم لہجے میں کہتا ——— "ہم نیچے اتر رہے ہیں ذرا سنبھل کے قدم رکھو !" اور سیاہ بوڑھا گھوڑا مشین کی طرح خود بخود دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگتا ۔ سڑک اتنی پھسلواں تھی کہ ہر ہر قدم پر ہمارے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے اور رات اتنی تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا ۔ پھسلتے ہوئے اور ایک دوسرے کو ٹکراتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے ۔ جہاں کہیں گھوڑوں پر سواری ممکن نہ ہوتی صدر ماؤ نیچے اتر جاتے اور ہمارے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے پہاڑ پر چڑھنے لگتے جب ہم نے چوٹی طے کر لی تو دیکھا کہ آگے کی زمین اور زیادہ کیچڑ سے بھری ہوئی تھی ۔ جب کبھی ہم نیچے کی طرف قدم اٹھاتے تو کیچڑ ہمارے جوتوں سے چمٹ جاتی اور ہمارے پیر وہیں جم جاتے ۔ رات اتنی تاریک تھی کہ جب کبھی ہماری قطار ذرا لمبی ہو جاتی تو پیچھے کے لوگوں سے رابطہ ٹوٹ جاتا ۔ آگے

ین چ

تر

اشفا



...ں کی مدد کے باوجود
...ٹیں نہ بڑھ سکا

...نگ لن

...اکر جمن

جلنے والے بار بار تالیاں بجاتے رہتے تھے تاکہ پیچھے والوں کو معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں ہیں۔ نیچے ایک گہری گھاٹی تھی اور ایک لمحہ کی غفلت بھی ہمیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی صدر ماؤ سکون کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔ ان کے کپڑے اور جوتے کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تاکہ اگر وہ پھسلیں تو میں انہیں تھام لوں۔ لیکن وہ بڑے سکون اور مستقل مزاجی کے ساتھ چلتے رہے۔ میں چلنے میں اتنا محو ہوا کہ ایک بار اچانک میرا پاؤں پھسل گیا اور میں گرنے ہی والا تھا کہ صدر نے جلدی سے اپنا لمبا ہاتھ آگے بڑھایا اور مجھے اوپر کی طرف کھینچ لیا۔ میرا دل تشکر کے جذبات سے معمور ہو گیا۔

سورج نکلنے تک ہم سیاؤ ہو پہنچ چکے تھے۔ پورا گاؤں بارش کے بعد کہر کی ہلکی سی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور غیر معمولی طور پر حسین دکھائی دے رہا تھا۔ اب ہم وانگ چھیاوان سے اسّی (۸۰) لی دور تھے۔ ہمارا دستہ وہاں رک کر آرام کرنے لگا۔ دوپہر سے کچھ پہلے ہمیں اپنے پیچھے بندوقوں اور توپوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ دشمن کے طیارے اوپر فضا میں چکر لگانے لگے۔ ہمارے مخبروں نے اطلاع دی کہ کامریڈ وانگ تنگ تسنگ دشمن سے دو دو ہاتھ کر رہے ہیں۔ ہمارا اپنا پلاٹون یانگ ای لاؤ وان کی ایک محفوظ بلندی سے دشمن کے تین بریگیڈوں کو روکے ہوئے تھا۔ وہ دشمن کے تین حملوں کو پسپا کر چکا تھا۔ توپخانے اور طیاروں کی مدد کے باوجود دشمن ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ ساڑھے تین گھنٹے کی لڑائی کے بعد جب کامریڈ وانگ تنگ تسنگ نے یہ دیکھا کہ ان کا مشن کامیاب ہو چکا ہے تو وہ خود ہی وہاں سے پیچھے ہٹ گئے۔

ہمارے مخبروں کی اطلاع کے مطابق دشمن کے ہر اول کے یونٹ اسی رخ پر پیش قدمی کر رہے ہیں جس طرف ہم جا رہے تھے۔ رات کے وقت ہم نے پھر اپنا مارچ شروع کر دیا۔ مطلع جو بالکل صاف ہو چکا تھا، ایک بار پھر رنگ دکھانے لگا اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ چوٹی کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتے وقت ہمیں نیچے سے مختلف اطراف سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے علاوہ ہمیں وادی میں بائیں طرف حدِ نظر تک بلند شعلے اٹھتے دکھائی دیئے۔ یہ شعلے مسلسل بھڑکتے رہے اور ان کی روشنی سے پوری وادی سرخ ہو گئی۔ یہ ہمارے دشمن تھے اور وہ بالکل ہمارے نیچے تھے۔ کامریڈ جن پی شیہہ نے یہ حکم جاری کیا کہ کوئی شخص اپنی فلیش لائٹ نہیں جلائے گا اور سگریٹ نہیں پیئے گا۔ ہم ذرا اور آگے بڑھے تو وہ شخص جو سب سے آگے تھا اچانک رک گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو یہ الفاظ پہنچائے —— "وہیں رکے رہو جہاں اس وقت موجود ہو" ہم پریشان ہو گئے اور ہمارے جسم پسینے میں بھیگ گئے۔ ہم اپنے لیڈروں کی زندگی کے بارے میں فکرمند تھے۔ حالات بہت سنگین تھے آخر ہم یہاں کیوں رکے؟ ہم نے ایک آدمی کو دریافتِ حال کے لیے بھیجا۔ ہوا یہ تھا کہ ہمارا کسان گائڈ راستہ بھول گیا تھا۔ ہماری فوج کے پاس آگے بڑھنے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم صرف یہ کر سکے کہ ہم نے ایک قریبی گاؤں سے دوسرا گائڈ لانے کے لیے آدمی بھیج دیئے۔ کسی بھی ہنگامی واقعے سے نمٹنے کے لیے ہم نے اپنے محافظوں کے دستے کے ایک پلاٹون کو تین مشین گنوں کے ساتھ ڈھلان کے نیچے بائیں طرف وادی کی ایک محفوظ پوزیشن پر متعین کر دیا۔ صدر ماؤ بارش میں کھڑے بھیگ رہے تھے۔ اس سپاٹ پہاڑ پر ایک بھی ایسی چٹان نہیں تھی جس پر بیٹھا جا سکتا تھا۔ محافظ شیہہ کو جوئی نے اپنا گٹھڑا کھولا اور اسے زمین پر ڈال دیا۔

"جناب صدر! یہاں بیٹھ جایئے!" اس نے کہا۔

"یہ گندا ہو جائے گا!" صدر ماؤ نے کہا

"کوئی بات نہیں ——!" شیہہ نے جلدی سے جواب دیا۔ —— "اگر یہ گندا ہو جائے گا تو میں اسے دھو لوں گا ——!"

صدر ماؤ نے کہا۔ —— "شکریہ!" اور پانی میں بھیگے ہوئے گٹھڑ پر بیٹھ گئے۔

بارش تیز اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پانی ہمارے چہروں سے پھسلتا ہوا کالروں کے اندر گھس رہا تھا۔ ہم نے سوچا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم یہاں ایک چھت بنا دیں تاکہ صدر ماؤ بارش سے محفوظ ہو جائیں۔ بدقسمتی سے وہاں کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ اچانک ایک شخص کو یہ ترکیب سوجھ گئی۔ بہت سے آدمی صدر ماؤ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس طرح ہوا کا زور ٹوٹ گیا اور جب ہم نے ایک پرانا لمبا سا کوٹ اوپر تان لیا تو بارش کا سدِ باب بھی ہو گیا۔

صدر ماؤ ہنسے —— "ایک حقیقی سیسے کی دیوار! نہ تو ہوا کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ بارش! لیکن تم لوگ ٹھٹھر جاؤ گے!"

"ہم جوان اور صحت مند ہیں، سردی کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا" —— ہم ایک آواز ہو کر بولے۔ ہم ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے اور واقعی ہمیں زیادہ سردی نہیں لگ رہی تھی۔

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمایئں

پاکستان پیپلز پارٹی اِس وقت برسرِ اقتدار ہے۔ مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان کے عوام کی اکثریت نے اس پارٹی کے منشور پر اعتماد کر کے اُسے اپنی نمائندہ جماعت کے طور پر منتخب کیا۔ اِس وقت پیپلز پارٹی عدم تنظیم کا شکار ہے۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں بددلی پھیل رہی ہے۔ حکومت اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں کوئی ہم آہنگی ہے یا نہیں۔ منشور پر عمل ہو رہا ہے کہ نہیں۔ اس موضوع پر ہم تمام عوام کو اور پارٹی کے کارکنوں کو لکھنے کی دعوت دیتے ہیں ——— (ادارہ)

پیپلز پارٹی کی حکومت
یا
حکومت کی پیپلز پارٹی!

فقیر حسین رانا

یہ مانا کہ سماج دشمن۔ سامراجی پٹھو۔ ظالم سرمایہ دار، بے رحم جاگیردار اور سازشی نوکر شاہی میں اب یہ سکت نہیں رہی کہ وہ انقلاب کا حقیقی راستہ روک سکیں مگر انقلابی قوتیں عدم تنظیم یا صحیح خطوط پر تنظیم اور پیشہ ور انقلابی کارکنوں کی فیصلہ کن تعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس لائق نہیں ہے کہ وہ استحصالی نظام کو مکمل طور پر کچل سکیں۔

اس کی مثال یوں لے لیجئے۔ ایک قافلہ جہاز پر سوار سمندر کے بیکراں سینے پر رواں دواں ہے۔ اِس کے ملاح فنکارانہ مہارت سے اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ جہاز میں سمت کا تعین کرنے کے لئے قطب نما موجود ہے اِس کے برعکس دوسرا قافلہ جس جہاز پر سوار ہے۔ اس میں سماجی ناانصافی کے سوراخ ہیں۔ جس میں غیر تربیت یافتہ غیر منظم ملاح ہڑلونگ اور افراتفری کا شکار ہیں۔ جس میں قطب نما نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔

آپ ان دونوں متذکرہ بالا قافلوں کی منزل پر پہنچنے کے بارے میں اِس کے باوجود کہ آپ کوئی نجومی یا خود ساختہ پروفیسر نہیں۔ پھر بھی آسانی سے پیش گوئی کر سکتے ہیں انقلابی تحریک ہو یا کہ سیاسی پارٹی، سماجی انجمن ہو یا کہ دینی جماعت ان سب کے اپنے مقاصد ہوتے ہیں۔ مقصد خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو مگر ہوتا ضرور ہے۔ بسا اوقات بہت سی جماعتیں بہت ہی درخشاں اقوال اور نیک اعلانات کے پس پشت انتہائی بھیانک انسانیت سوز عزائم رکھتی ہیں۔ جس کی مثالیں آپ کے گرد و پیش میں موجود ہیں اور اسی طرح بہت سی پارٹیوں میں نعرہ اور منزل کی ہم آہنگی ہوتی ہے وہ بھی آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ مگر ان تمام جہتوں کی ایک قدر مشترک تنظیم ہے۔ مختلف منزلیں اور جداگانہ عقائد رکھنے والے سب ہی تنظیم کی افادیت کے قائل ہیں۔ تنظیم ہی ایک ایسی چیز ہے جسے نظر انداز کرنے یا صحیح خطوط پر قائم نہ رکھنے کے سبب کوئی بھی قافلہ اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ بسا اوقات غیر منظم قافلہ طویل سفر اور نامساعد حالات کا شکار ہو کر مسائل کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بہت ہی منظم جماعت اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کے ابتدائی مراحل میں ہی بُری طرح ناکام ہو جاتی ہے اور اپنی منزل سے پہلے کے مقابل اور دور ہو جاتی ہے۔ اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ تنظیم کا نقص تھا بلکہ منزل سے ہمکنار ہونے کے لئے تنظیم کا صحیح سمت ہونا بھی کامیابی کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ محض دلکش جذباتی نعرے اسلاف کے سنہرے کارناموں کے دوش پر بازار میں لانا ہی اس امر کے لئے کافی نہیں کہ عوام ہوش کو خیرباد کہہ کر صرف جوش سے کوئی فیصلہ کر لیں جو بالآخر جماعت پر قابض چند افراد کو پس پردہ عزائم حاصل کرنے کے عمل کو کامیابی عطا کر سکے۔

بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ کوئی جماعت بہت ہی ظالمانہ نظام کو کسی گہرے مؤثر نفسیاتی نعرے کے بل بوتے پر ایک بڑی کامیابی کی شکل میں کسی ملک کی سیاست و معیشت پر مسلط کر دیتی ہے۔ مگر اس جماعت کے مقاصد بنی نوع انسان کی اکثریت کے خلاف ایک گھناؤنی سازش کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔ اس جماعت کے رہنماؤں کی سوچ غیر حقیقت پسندانہ تقاضۂ وقت کے خلاف اور تاریخِ ارتقاء ——— کے اصولوں کے فلسفی ہونے کی وجہ سے سماجی ترقی میں سدِ راہ بن جاتی ہے۔ اور پھر وہی ہوتا ہے جو کہ قانونِ قدرت کی رو سے ہوتا آیا ہے۔ یعنی ملک کے مظلوم اور مصیبت زدہ عوام پھر اپنی حقیقی منزل کی طرف حقیقت پسندانہ نظریات سے مسلح ہو کر انقلابی پرچم تلے جمع ہو جاتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دیتے ہیں۔

آپ کے سامنے مسلم لیگ بھی ایک نظیر کے طور پر پیش خدمت ہے۔ آپ حضرات اس حقیقت سے واقف ہیں کہ مسلم لیگ کی تنظیم کس طرح کی تھی۔ مسلم لیگ کو صرف مخصوص گروہ کی اجارہ داری کہا جا سکتا تھا۔ اِس تنظیم میں عوام کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ سارے فیصلے محلوں کی نشست و برخاست کے مرہونِ منت تھے۔

سرِ دست یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلم لیگ جس کے سر حصولِ پاکستان کا سہرا ہے اور جس کے پھول خود اس نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالے۔ اس ملک میں دم توڑ گئی چونکہ وہ اپنے مقصد میں مخلص نہ تھی۔ جو کہ خود بقول اُس کے اُس نے تنہا اپنی حکمت عملی سے پاکستان قائم کیا تھا۔ اِس جماعت کی نظر میں عوام نے کچھ نہیں کیا۔ کتنی ڈھٹائی سے اعلان کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر ملک حاصل کر لیا۔ دوسرے ہی سانس میں لوگوں سے خطاب کرتے وقت اُن کی بے شمار جانی و مالی قربانیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کتنی بے اصولی اور گمراہ قیادت تھی اس جماعت کی تباہی کا باعث عوام اور حکمران طبقے کا متضاد مفاد اور متضاد کردار تھا۔ مسلم لیگ نے کبھی عوام پر بھروسہ نہیں کیا مسلم لیگ کی تنظیم جن خطوط پر تھی اِس میں ناانصافی، خود غرضی اقرباء پروری، دوست نوازی، حق تلفی، بے ایمانی، رشوت خوری۔ چور بازاری۔ سٹہ بازی، حیا سوزی، اسمگلنگ کا پروان چڑھنا قدرتی امر ہے۔

مسلم لیگی قیادت نے دیدہ و دانستہ یہ مذموم حرکت کی کہ سرکاری عہدہ اور جماعت کا عہدہ آپس میں گڈمڈ ہو جائیں۔ مخالفوں کو غدار کہہ کر خاموش کرنا ان کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ مسلم لیگ کی جڑیں عوام میں سے کٹ گئیں اور بعد ازاں وہ بالکل تباہ ہو گئی۔

متذکرہ بالا دو مثالیں ہمارے ملک کی سیاسی جماعتوں کے کردار کو سمجھنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور مدد دے سکتی ہیں اور ہم ایک تنظیمی پیمانہ بنا کر ہر جماعت کو اس کے اصل روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ تنظیمی پیمانہ کیا ہو اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے۔

(۱) سیاسی پارٹی کی تنظیم نچلی سطح سے ہونی چاہیئے۔
(۲) پارٹی کا عہدہ صلاحیت کی بنیاد پر دیا جانا چاہیئے۔
(۳) پارٹی کا کوئی نظریہ ضرور ہونا چاہیئے۔
(۴) پارٹی کا عہدیدار نظریات سے مسلح ہونا چاہیئے۔

غیر منظم پارٹی اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی

(۵) حکومتی عہدہ اور پارٹی کا عہدہ ایک ساتھ نہیں ہونا چاہیئے۔

(۶) کوئی بھی شخصیت یا عہدہ دار تنقید و محاسبے سے بالا نہیں ہونا چاہیئے۔

پیپلز پارٹی کا دعویٰ ہے کہ وہ انقلابی تحریک ہے۔ پارٹی کا یہ بھی دعوےٰ ہے کہ وہ ایک نظریاتی پارٹی ہے۔ پیپلز پارٹی نے اکثر و بیشتر نہیں بلکہ ہمیشہ اپنے منشور میں سوشلزم کو نظریاتی اساس کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ تو ہوئی اس کی نظریاتی اور کرداری حیثیت۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کثیر طبقاتی جماعت ہمیں مزدوروں، کسانوں۔ طالب علموں۔ دانشوروں۔ فنکاروں ادیبوں۔ شاعروں۔ صحافیوں۔ وکیلوں۔ ڈاکٹروں۔ چھوٹے کاروباری لوگوں، ٹھیلے والوں، فٹ پاتھ پر روزی کمانے والوں غرض یہ کہ تقریباً ۹۰ فیصد عوام کے طبقات شامل ہیں۔ جن کے طبقاتی مفاد متضاد ہیں۔ کس طرح اور کس اصول کے تحت یہ پارٹی انقلابی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس جگہ ہم پاکستان میں بسنے والے تمام طبقات کو اپنے طبقہ واری کردار اور مفاد کے پیش نظر صرف دو طبقوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ نظریاتی بات یہ ہے کہ انقلاب کی ضرورت صرف غریب عوام ہی کو ہے کیونکہ ان ہی کے مسائل حل طلب ہیں کیونکہ وہ ہی اس جبر و استبداد کی چکی میں پس رہے ہیں چونکہ ہر طرح کے ظلم کا براہ راست وہی نشانہ بنتے ہیں۔ جن کے مسائل حل ہیں ان کی وفاداری انقلاب سے مشکوک ہی نہیں ناممکن ہوتی ہے۔ اگر وہ منافقانہ طور پر وفاداری کا دم بھرتے بھی ہیں تو صرف اپنے آپ کو عوام کے غیض و غضب سے بچانے کے لئے اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے وہ انقلاب کو دور رکھنے کے لئے سازشیں کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ مارِ آستین اپنی حیاء سوز چالوں میں کامیاب ہو کر عوام کے خون سے ملک کی سڑکوں، بازاروں۔ فیکٹریوں۔ کھیتوں، درسگاہوں اور یہاں تک کہ عبادت گاہوں کو لالہ زار بنا دیتے ہیں اور اسی مذموم حرکت سے کچھ اور دن تک استحصال جاری رکھ لیتے ہیں۔ ایک بات آپ بالکل ذہن میں محفوظ کر لیں کہ لٹنے والا اور لوٹنے والا کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ ظالم اور مظلوم کا کوئی یارانہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صاحب ثروت شخص جب کبھی اپنے ضمیر کی آواز سُن کر غرباء کی طرف نظر کرم کرتا بھی ہے تو وہ اس وقت اپنے طبقہ واری کردار سے بغاوت کرتا ہے اگر فوراً ہی اسے سنبھال نہ لیا گیا تو اس کی رجعت اپنی اصل کی طرف جلد یا بدیر ہو جاتی ہے۔ اگر ایسے افراد کسی ایسی تحریک میں آ جاتے ہیں تو ان کا سخت محاسبہ ہی ان کو رجعت پرستی سے روک سکتا ہے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ تحریک پر عوام دوست انقلابی سوشلسٹوں کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہو اِس اصول کا منکر انقلاب دشمن اور سامراجی ایجنٹ ہی ہو سکتا ہے۔ محبِ وطن نہیں۔

آپ چند سطور کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اِس میں آپ کو ایک اہم کلیہ میری گذارشات کی تائید کرتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ میں آپ صاحبان کے سامنے کھول کر رکھ رہا ہوں۔ پیپلز پارٹی میں بھی سرمایہ دار، جاگیردار نہ جانے کس جذبے کے تحت رونق افروز ہیں۔ جب کہ سوشلزم کی کسی بھی کامیابی سے اپنے آپ کو خوش حال بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، صرف اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے جیتے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں۔ میں بالکل یقین سے تجربات کی روشنی میں اور تاریخ کے آئینہ میں یہ بات دیکھتا ہوں کہ اگر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا پارٹی پر قبضہ ہو گیا تو وہ ایسا ہی سوشلزم لائیں گے جیسا کہ مسلم لیگ اسلام لائی ہے۔

پیپلز پارٹی میں طبقاتی کش مکش کے رجحان اور حقیقت کو نظر انداز کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی۔ کثیر الطبقاتی پارٹی میں یہ مظاہرہ ہوتا ہے اُسے نظر انداز کرنا یاد بانا سیاسی تدبّر کی عدم موجودگی کا مظہر ہے۔ پارٹی میں موجود ہر دو طبقے اپنے اپنے کردار کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اندرونی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ امر ناگزیر ہے۔ اسی عمل سے انقلابی راستہ متعین ہوتا ہے! اسی جدوجہد میں اندرونِ صفِ انقلاب دُشمن عناصر کی نشاندھی ہوتی ہے۔

پارٹی میں نظریاتی اور اصولی جنگ ناگزیر ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جسے ہر محاذ پر ہونا ضروری ہے۔ انقلابی سوشلسٹ ملک کے درخشاں مستقبل۔ امن اور انصاف کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اندرونی محاذ پر موقع پرست انقلاب دشمن سرمایہ دار اور سامراجی ایجنٹوں سے نبرد آزما بھی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف عوام کی سیاسی اور نظریاتی تربیت کا عظیم کام بھی ان کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہ روز مرّہ کے مسائل کے ساتھ شعور کے ارتقاء کی جدوجہد میں کوشاں رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر مزدور کسان۔ طلباء اور عوام کے اجتماعی اداروں کو سوشلزم کی ابتدائی درس گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ نظریاتی تبلیغ ہو سکے اور عوام اپنا فیصلہ کن کردار ادا کر سکیں، اور ایک غیر استحصالی نظام قائم ہو سکے۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جو کہ انقلابی سوشلسٹ اپناتے ہیں۔ مگر ان کے مدِمقابل چونکہ موقع پرست، انقلاب دشمن اور بورژوا طبقے کے گماشتے ہوتے ہیں۔ وہ اصولی جنگ میں ہار جانے کے خوف سے گھٹیا اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آتے ہیں۔ ان کی پشت پر پارٹی کا مفاد پرست سرمایہ دار طبقہ پوری حیاسوزی سے مع اپنے وسائل کے کارفرما ہوتا ہے۔ اس سرمایہ دار طبقے کے رشتے دار کے طور پر انتظامیہ اور دیگر سرکاری اداروں سے ہوتے ہیں اور وہ بڑی بے حیائی سے انقلابی کارکنوں کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کوشش ہوتی ہے کہ نچلی سطح پر پارٹی کارکنوں میں اپنے پٹھوؤں کے ذریعے پھوٹ ڈالی جائے اور اگر کوئی کارکن عوام کی معقول شکایت لے کر پولیس یا اور کسی ادارے میں جاتا ہے تو سرمایہ دار کا پٹھو اس کے خلاف دوسرے فریق کی سرپرستی کرتا ہے اور اپنے آقاؤں کا اثر و رسوخ استعمال کر کے بدمعاشوں اور سماج دشمن عناصر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تاکہ مقابل کارکن کا اثر علاقہ میں نہ جم سکے اور سرمایہ داروں کا دلال علاقہ کی قسمت کا فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق کر سکے۔

تنظیمی معاملات میں لڑاؤ اور راج کرو کے اصول کے تحت کام ہوتا ہے۔ سرمایہ داروں کا پٹھو بدقسمتی سے علاقہ کا لیڈر ہر چھوٹے سے چھوٹے علاقہ میں دو یا دو سے زیادہ دفاتر قائم کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر دو دفتر کے کارکن زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کر کے اس نام نہاد رہنما کا قرب حاصل کرنے اور توڑ جوڑ سے آگے بڑھنا علین سیاسی عمل تصوّر کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کارکن اور عوام دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور غیر صحت مند ماحول وجود میں آ جاتا ہے۔ جو پارٹی کو تباہی کے غار تک پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ موقع پرست کارکن اِس لئے کرتا ہے کہ کوئی باصلاحیت کارکن آگے نہ بڑھ سکے اور ساتھ ہی ساتھ وہ محاسبے سے محفوظ رہ سکیں۔ پارٹی کو کمزور کر کے انقلاب کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔

پیپلز پارٹی کی تنظیم اصولی اعتبار سے اپنا ابتدائی مرحلہ بھی طے نہیں کر سکی ہے۔ تنظیم نویسی۔ ایک کنونشن کے بعد علاقہ واری نامزدگیاں تنظیم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ ابتدائی زمانہ میں خلاء پُر کرنے کے لئے ہائی کمان کی یہ صرف ایک کوشش تھی۔ جس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ نامزد شخصیت واقعی پارٹی کے نظریات۔ منشور یا پروگرام کی پرتو بن سکتی ہے۔ جس



کی نظیر کئی علاقوں میں ملتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایسے افراد پارٹی میں ہر جگہ موجود ہیں۔ ایسے افراد کی اکثریت مصلحت بینی کی بناء پر خاموش ہے۔ پارٹی میں اقتدار یافتہ افراد سے کسی نہ کسی عنوان سے منسلک ہیں۔ ایسے افراد سوشلزم کے بدترین دشمن ہوتے ہیں۔ ان کے خودغرضانہ کردار سے متاثر ہو کر بھولے بھالے عوام سوشلزم سے اگر متنفر ہو گئے تو اس ملک کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ یہ ملک صدیوں کے لئے آثار قدیمہ بن کر رہ جائے گا۔ اس کا سدباب صرف عوامی سطح پر تنظیم ہی کر سکتی ہے۔ کسی فردِ واحد کا حکم اس بیماری کا علاج نہیں

پیپلز پارٹی بے ربط اور غیر تسلی بخش تنظیمی ڈھانچہ کے جواز میں بہت کچھ عذرِ لنگ کے طور پر پیش کر سکتی ہے۔ مگر دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا یہ عذر اس نقصان کو ہونے سے روک لے گا جو کہ عدم تنظیم سے پارٹی اور ملک کو ہونے والا ہے۔ میری نظر میں پارٹی کے ذمہ دار افراد یہ نہ سوچیں کہ ابھی ملک اہم مسائل سے دوچار ہے۔ لہٰذا تنظیم کے معاملات میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ یہ سوچ ایک انتہائی تباہ کن راستہ کا سنگ میل ہے۔ کیونکہ اگر پارٹی منظم نہ ہوئی تو خارجی اور داخلی سازشیں نہ روک سکے گی اور نہ ہی اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے گی۔ اس وقت پیپلز پارٹی کے قائدین کو وقتی واہ واہ کے جھولے میں خوابِ خرگوش میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے۔ ایسے بہت ہی حسین قصیدے جناب بھٹو صاحب کے پیش رو افراد کو بھی پیش کئے گئے تھے۔

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ جناب بھٹو صاحب تنظیمی امور کو اپنے آزمودہ کار ساتھیوں پر چھوڑ دیں اور خود حکومت کی رہنمائی کریں اور اس امر کے لئے پیپلز پارٹی کی ہدایات حاصل کر کے یہ ثابت کر دیں کہ حکومت کی پیپلز پارٹی نہیں ہے بلکہ پیپلز پارٹی کی حکومت ہے۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی سوشلسٹوں کو چاہیئے کہ وہ حکومت سے الگ ہو کر تنظیم کو از سرِ نو ایسی زندگی بخشیں جو کہ ایک انقلابی تحریک کی شایانِ شان ہو۔

جب صدارت۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، وزیر اعظم وزیرِ دفاع۔ وزیر خارجہ، وزیر داخلہ کے باہم الجھے ہوئے ہونے کی بات ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب کی قیادت پر اعتماد ہی کافی ہے۔ وہ سب کچھ ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ہر کام ٹھیک ہو جائے گا اور جب قیادت کے محاسبے کی اصولی بات ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب کی ذات پر بھروسہ بہت ضروری ہے۔ گویا تنظیم کے بدلے بہت ہی سستا نسخہ پیش کر کے اصولوں کو مصلحت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ ایسی بات غیر نظریاتی اور بے عمل لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

شہنشاہ حسن

خونِ مزدور رنگ لائیگا

قوم کی آن بان مزدورو　　ملک و ملت کی جان، مزدورو
تم، کہ عزتِ نشان مزدورو　　صبحِ نو کی ہو شان، مزدورو

انقلاب، انقلاب آئے گا
خونِ مزدور رنگ لائے گا!

سرخ ہے ایشیا، کہے جاؤ　　ظلم سے ہر گھڑی لڑے جاؤ
ہر قدم عزم سے بڑھے جاؤ　　میری آواز بھی سنے جاؤ

انقلاب انقلاب آئے گا
خونِ مزدور رنگ لائے گا

سختیٔ زیست گھٹ ہی جائیگی　　رات تاریک کٹ ہی جائیگی
غم کی بدلی بھی چھٹ ہی جائیگی　　راہِ دشوار پٹ ہی جائیگی

انقلاب انقلاب آئے گا
خونِ مزدور رنگ لائے گا

نارسیدہ جواب آئیگا　　ہر بقایا حساب آئیگا
بستیوں پر شباب آئیگا　　کوٹھیوں پر عذاب آئیگا

انقلاب انقلاب آئے گا،
خونِ مزدور رنگ لائے گا



THE WORLD ATLAS

SECOND EDITION

MOSCOW





ماسکو کے مطبوعہ
عالمی اٹلس نے
گلگت اور بلتستان
کو بھارت کا حصّہ
قرار دیدیا



کاشگار

روسی سوشل سامراجی اپنے پاکستان دُشمن کردار پر فخر کرتے ہیں

"برصغیر کے معاملے میں ہم نے جو کچھ کیا، وہ بالکل جائز تھا اور اگر تاریخ نے اپنے آپ کو دُہرایا تو ہم پھر وہی کچھ کریں گے"

کوسیجن (پاکستان ٹائمز ۱۸ مارچ ۷۲ء)

سوویت یونین کے وزیر اعظم نے یہ الفاظ صدر بھٹو کے حالیہ دَورۂ ماسکو کے دوران ایک استقبالیہ میں کہے: یہ الفاظ سوویت حکمران ٹولے کے ذہنی پس منظر کے عکاس ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت سوشل سامراج اپنے اس پاکستان دشمن کردار پر فخر کرتا ہے جو انہوں نے حالیہ پاک بھارت جنگ میں ادا کیا جس کا نتیجہ سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ان الفاظ میں یہ دھمکی بھی پوشیدہ ہے کہ اگر مغربی پاکستان میں مٹھی بھر علیحدگی پسندوں نے عوامی لیگ کا راستہ اپنایا تو سوویت یونین ان کی حمایت کرے گا۔

اس اعلانیہ پاکستان دشمنی کے باوجود صدر بھٹو نے سوویت سوشل سامراج کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور لاہور کے جلسۂ عام میں عوام سے اس دوستی کی توثیق بھی کروائی۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں صدر بھٹو اس غلطی کا اعتراف کریں۔ جیساکہ شیخ مجیب کی رہائی کے سلسلے میں کیا ہے۔

درحقیقت سوویت حکمران ٹولہ چین کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف ہے۔ کامریڈ اسٹالن کے بعد سوویت ترمیم پسند حکمرانوں نے امریکی سامراج سے گٹھ جوڑ کرکے چین کے گرد حصار بنانے کے منصوبے بنائے۔ کشمیر کی ایک سرحد چین سے ملتی ہے۔ سوویت حکمرانوں نے ناپاک منصوبوں کی تکمیل کے لیے بھارت سے دوستی کی۔ وہ پنڈت نہرو کے ذہنی پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔ وہ نہرو کی "عظیم سلطنت" کے بارے میں بھی جانتے تھے جس کا خواب انہوں نے اپنی کتاب "ہندوستان کی دریافت" میں دیکھا تھا۔ بھارت کو چین کے خلاف صف آرا کرنے کے لیے سوویت حکمرانوں نے نہرو کی کمزوری "کشمیر" سے فائدہ اٹھایا۔ مارشل بلگانن نے دورۂ بھارت کے دوران کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیا تاکہ اگر کشمیر پر بھارت کا قبضہ ہوجائے تو چین کو ایک سمت سے گھیرا جاسکتا ہے۔

یہی وہ منصوبہ تھا جس کے تحت ۱۹۶۰ء میں خروشچیف نے دورۂ بھارت کے دوران کہا — "میں ذاتی طور پر اور سوویت حکومت اپنی خارجہ پالیسی کے اہم تقاضوں کے تحت کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ سمجھتی ہے" اس جملہ میں "اپنی خارجہ پالیسی کے اہم تقاضوں کے تحت" کے الفاظ قابلِ غور اور قابلِ توجہ ہیں۔ اور ان ہی "اہم تقاضوں" کے تحت جنوری ۱۹۶۶ء میں سوویت سوشل سامراجیوں نے "اعلانِ تاشقند" کروایا۔ کہا جاتا ہے کہ "آف دی ریکارڈ" کوسیجن نے مشورہ دیا تھا کہ "جو تمہارے پاس ہے تم رکھو جو بھارت کے پاس ہے اس کے پاس رہنے دو۔ اگر کسی جگہ مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ پاکستان کا حصہ ہے۔ اس طرح کل آپ تاجکستان اور ازبکستان کو بھی پاکستان کا حصہ بنائیں گے"۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی چین کے گرد حصار مکمل نہیں ہوا۔ پاکستان کی سرحدیں گلگت اور بلتستان کی جانب سے بھی چین سے ملتی ہیں۔ یہ علاقہ چین اور پاکستان کا سنگھم ہے۔ اس لیے ریاست جموں و کشمیر کے متنازعہ علاقہ سمیت گلگت اور بلتستان کو سوویت یونین بھارت کا حصہ تسلیم کرتا ہے۔ سوویت عالمی اٹلس مطبوعہ ماسکو کا دوسرا ایڈیشن اس کی شہادت دیتا ہے۔ اس اٹلس میں ریاست جموں و کشمیر کے علاوہ گلگت، بلتستان پر مشتمل پاکستان کے شمالی علاقوں کو بھارت کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت ترمیم پسند پچاس لاکھ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اس نے مشرقی پاکستان میں مٹھی بھر علیحدگی پسندوں کی محض "حق خود ارادیت" کے نام پر امداد اور حمایت کی۔ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اقوام متحدہ کی قراردادیں، پنڈت نہرو کے وعدے اور اقوام عالم اس بات کے شاہد ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ابھی ہونا باقی ہے۔ کشمیریوں کو رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے لیکن سوویت ترمیم پسند حکمرانوں نے انتہائی بددیانتی اور گھناؤنی سازش کرکے اپنی عالمی اٹلس میں اسے بھارت کا حصہ قرار دے کر عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے ان علاقوں کو بھارت کا علاقہ قرار دے کر چین سے پاکستان کی ملتی ہوئی سرحد کو ختم کرنا، پاک چین دوستی میں رخنہ ڈالنا اور چین کے گرد حصار قائم کرنا ہے۔

سوویت یونین پاکستان کی بھارت سے دوستی اور صلح کرانا چاہتا ہے۔ بھارت کا حلیف ہونے کی وجہ سے وہ اس کے توسیع پسندانہ منصوبوں سے بخوبی واقف ہے بھارت کے منصوبے کیا ہیں۔ وہ بھارتی اخبار "انڈین ایکسپریس" سے سُنیئے:۔

نئی دہلی (۱۳ مارچ) بھارتی منصوبہ کے مطابق دیرپا امن کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ملک موجودہ جنگ بندی لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرلیں اور پاکستان ریاست جموں و کشمیر کے مقبوضہ علاقے پر بھارت کی حکمرانی تسلیم کرے۔ پاکستان برصغیر میں پرامن ماحول کے لیے بنگلہ دیش کو تسلیم کرے۔ باخبر حلقوں کے مطابق اس منصوبے کے تحت دوسری شرط یہ رکھی گئی ہے کہ ۹۰ ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کے مسئلے کو امن اور مفاہمت سے الگ نہیں رکھا جاسکتا ان پاکستانی قیدیوں نے بنگلہ دیش اور بھارتی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار رکھے ہیں۔ اس لیے ان کی واپسی کے لیے بنگلہ دیش کی منظوری ضروری ہے کوئی ملک چار ڈویژن فوج کو اس وقت تک واپس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا جب تک اس کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو۔ صدر بھٹو کو اس علاقہ میں دیرپا امن کی ضرورت کا احساس کرلینا چاہیئے اور راوی اور ستلج کے اس پار گھرے ہوئے علاقوں میں کچھ ردوبدل قبول کرکے آئندہ تصادم کے تمام امکانات کو ختم کردیں"

یہ ہیں بھارتی جنگی دیوتاؤں کی شرائط امن، جن سے برزنیف ٹولہ نہ صرف واقف ہے بلکہ تائید اور حمایت بھی کرتا ہے۔ پاکستان کے عوام ان شرائط امن پر سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ وہ اپنی بقاء اور آزادی کے لیے زمین کے چپہ چپہ کو اپنے لہو سے رنگ دیں گے۔

ایک سال میں ۲۵ روپے کے صرف چار پروگرام دیتے گئے

نابینا فنکار امیر احمد پر

ریڈیو پاکستان کے دروازے بند کر دیئے گئے

نعیم الحسن

بہت دنوں کی بات ہے: لانڈھی اسٹیشن پر لوکل ٹرینیں گھنٹے گھنٹے بھر قیام کرتی تھیں۔ ایک نابینا فنکار امیر احمد گانا سُنا کر میٹھی گولیاں فروخت کرتا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ گیت کے ہر بول میں اس کے جذبات کا اتار چڑھاؤ شامل ہوتا۔ لوکل ٹرین کے بیشتر ڈبوں میں لانڈھی، کورنگی کے مِلوں میں کام کرنے والے مزدور سفر کرتے تھے۔ وہ امیر احمد کا انتظار کرتے اور جونہی وُہ بوگی میں داخل ہوتا مزدور اسے گھیر کر بیٹھ جاتے۔ گانے کی فرمائش کرتے۔

"حافظ جی! گانا سناؤ گے تو میٹھی گولیاں خریدیں گے!"

حافظ جی... اپنے سینے کا سارا درد سمیٹ کر گانا شروع کرتے

ع۔ بعد مرنے کے بوجھ ہُوا سبھی کو محسوس!
دفن کر دو اسے اس ڈھیر میں رکھا کیا ہے؟

نابینا امیر احمد گانا ختم کرتا تو یار لوگ دوسری فرمائش کر کے شور مچانے لگتے۔ مزدور امیر احمد کو پیار اور محبت سے "حافظ جی" کہتے تھے —— "حافظ جی ایک اور ہو جائے! حافظ جی "ٹوٹے دل کی فریاد" والا گانا سناؤ... خدا قسم ساری گولیاں خرید لوں گا۔" امیر احمد میں مزدور بھائیوں کی فرمائش ٹالنے کی سکت نہ تھی... اور وہ دوسرا فرمائشی گیت شروع کر دیتا۔

ع۔ کون میرے ٹوٹے دل کی فریاد سُنے
آج میری تقدیر کا مالک سوتا ہے
قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے

امیر احمد گانا ختم کرتا تو اس کی میٹھی گولیاں ہاتھوں ہاتھ بِک جاتیں۔ ایک ایک مزدور درجن دو درجن گولیاں خرید لیتا۔

امیر احمد نے پچھلے دنوں کو یاد کرتے ہوئے مجھ سے کہا —— "لوکل ٹرین کے مزدور بھائی آج بھی یاد آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مزدور تو اتنے حساس تھے کہ میرا گانا سُن کر رونے لگتے تھے۔ وہ میری آواز کے سب سے بڑے مداح تھے۔ صرف ایک گھنٹے میں دن بھر کی کمائی کر لیتا۔ بعد میں مجھے ریڈیو پر ایک آدھ پروگرام بھی ملنے لگا۔ لوگ مجھے فنکشنوں میں بلانے لگے مگر.... ایسے لوگ مجھے دوبارہ نہیں مل سکیں گے۔"

امیر احمد نے بتایا —— "وُہ اوکاڑہ میں پیدا ہُوا۔ تین سال کی عمر میں ایک مولوی نے گوشت کی ایک بوٹی پر "دم" کر کے زمین میں دفن کر دی جس سے میری آنکھوں کی بینائی ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ مجھے بچپن ہی سے گانا سننے کا شوق تھا۔ اِدھر اُدھر ریڈیو اور ٹرانسسٹرز پر گانے سن کر اپنا شوق پورا کرتا۔ نور جہاں، سلیم رضا، طلعت محمود، محمد رفیع اور فضل حسین کی آواز مجھے بہت پسند تھی۔ میرے والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ میں تنہا تھا۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا جس سے میں اپنا دُکھ درد بیان کرتا۔ میرے جذبات گھُٹے" تھے اور جب مَیں گاتا تو میری زندگی کی ساری مایوسی اور محرومی آواز کے ذریعے باہر اُبل پڑتی —— کچھ دنوں کے بعد میں اوکاڑہ سے کراچی آ گیا۔ پہلے لانڈھی میں رہتا تھا۔ پھر ملیر میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہنے لگا۔ مَیں اکثر ریڈیو پاکستان ہیڈ کوارٹر کے کنٹین میں گانے گاتا تھا۔ لوگ مجھ سے گانے کی فرمائش کرتے تو مجھ سے انکار نہ ہوتا۔

ایک دن ریڈیو اسٹیشن کا ایک چپڑاسی (اس کا نام شکور ہے) کہنے لگا —— "تم تو بہت اچھا گاتے ہو۔ مَیں تمہیں یہاں کے ایک افسر سے ملواؤں گا۔ شاید تمہارا کام بن جائے۔"



میں نے کہا —— "مَیں اس افسر کے ساتھ ضرور بات کروں گا۔"

چپڑاسی شکور نے میری ملاقات جس افسر سے کرائی ان کا نام ظفر تھا۔ لوگ انہیں ظفر صاحب کہتے تھے۔ انہوں نے مجھے ریڈیو اسٹیشن جانے کا مشورہ دیا اور ایک چِٹ لکھ کر دی۔ دوسرے دن آڈیشن کے لیے ریڈیو اسٹیشن بندر روڈ گیا۔ میں آڈیشن میں کامیاب ہو گیا۔ پروگرام کے انچارج جمیل زبیری تھے۔ ان کے ذریعے مجھے پروگرام ملنے لگا۔ اس طرح ریڈیو پر گانے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا تبادلہ ہو گیا ان کی جگہ رضی اختر شوق آئے وہ بھی گاہے گاہے مجھے پروگرام دیتے تھے پھر ان کا بھی تبادلہ ہو گیا۔ اور ان کی جگہ ایک اور صاحب اکرم بٹ آ گئے۔ انہوں نے پروگرام دینا بند کر دیا۔ مَیں نے بہت کوشش کی مگر وہ انکار ہی کرتے رہے۔ ان کے انکار کی وجہ سمجھ میں نہ آئی ویسے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہُوا کہ ریڈیو جیسے قومی ادارے میں غریب اور بے سہارا فنکاروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پروگرام انچارج کی مرضی ہوئی تو پروگرام مِل گیا۔ ورنہ ہم جیسے لوگوں کا ریڈیو پر داخلہ بھی ممنوع ہوتا ہے۔

میں دوسرے دن طاہر شاہ کے گھر گیا ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا احوال سنایا۔ انہوں نے مجھے

ٹکا سا جواب دیا ——— "ہم تمہیں زیادہ پروگرام نہیں دے سکتے۔ تم نابینا ہو، غزلیں کیسے یاد کرو گے؟"

میں نے ان سے عاجزی سے کہا ——— "ایک تو میں معذور ہوں، دوسرے مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ پروگرام ملنے سے گزارہ ہو جاتا ہے، میرے لیے کچھ کیجئے ....!"

انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "دفتر آنا بات کروں گا۔"

میں نے ان سے کہا ——— "چٹ لکھ کر دے دیں گیٹ والے اندر نہیں جانے دیتے۔ بہت پریشان کرتے ہیں ...."

دوسرے دن ان کی پرچی لے کر اکرم بٹ کے پاس گیا۔ انہوں نے فوراً ایک پروگرام مجھے دے دیا۔ اس طرح بڑی مشکلوں سے مہینے میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بار پروگرام ملنے لگا۔ ممتاز گلوکار ایم کلیم اکثر میرے لیے سفارشیں کرتے مگر کوئی توجہ نہ دیتا۔ میرا پروگرام پھر کینسل کر دیا گیا۔ میں بے روزگاری اور شوق کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے چکر کاٹتا رہا۔ گیٹ والے بہت پریشان کرتے اندر نہیں جانے دیتے۔ کہتے ——— "بھاگ جاؤ یہاں تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

میرے ایک دوست نے مجھے گورنر سندھ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ میں گورنر سندھ سے ملنے گیا تو میری ملاقات سیکرٹری صاحب سے کرائی گئی۔ سیکرٹری صاحب نے مجھے ایک افسر کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے ریجنل منیجر ریڈیو پاکستان کے نام ایک خط لکھ کر دیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ خط لے کر معروف صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے وہ خط رکھ لیا اور ایک پروگرام دے کر مجھے ٹرخا دیا۔ اِدھر کچھ دنوں سے ریڈیو والوں نے مجھے پروگرام دینا بالکل بند کر دیا۔

امیر احمد نے بتایا کہ انہوں نے باقاعدہ کسی استاد سے یہ فن نہیں سیکھا۔ البتہ اِن دنوں میں استاد مبین سے ہارمونیم سیکھ رہا ہوں۔ ایم کلیم بہت اچھے آدمی ہیں انہوں نے مجھے ایک ہارمونیم لے کر دے دی۔ اپنے لانڈھی کے مزدور بھائیوں کے بعد ایم کلیم مجھ سے اتنے خلوص اور محبت سے ملتے ہیں۔

ریڈیو کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا ——— "یہاں "اپنے اپنوں" کو پروگرام دینے کا رواج ہے۔ مجھ جیسے غریب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اگر ریڈیو اسٹیشن کے دروازے ہر غریب اور اچھے فنکار پر کھل جائیں تو ریڈیو کا پروگرام بھی اچھا ہوگا اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی بھی ہو گی۔ میرے تجربے میں یہ بات ہے کہ جب کسی بڑے آدمی یا افسر نے سفارش کر دی تو پروگرام مل گیا ... ویسے کوشش کی تو مجھے گیٹ کے اندر بھی داخل نہیں ہونے دیا گیا۔"

اس نے بتایا کہ "ابھی تک اسے ایک سال میں زیادہ سے زیادہ چار پروگرام ملے ہیں۔ ایک پروگرام پر اسے ۲۵ روپے ملتے ہیں اس طرح ایک سال میں صرف ۱۱۰/ روپے کا پروگرام دیا گیا۔"

پروگرام پروڈیوسر اور آرگنائزر دلیسے سال بھر میں کتنے روپے اَللّے تللّے خرچ کر دیتے ہیں، یہ ایک علیحدہ کتھا ہے۔ نابینا فنکار امیر احمد، ایم کلیم اور حبیب ولی محمد اور نورجہاں کی آواز کو بہت پسند کرتا ہے

ایک نابینا فنکار پر قومی ادارے ریڈیو پاکستان کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ دروازہ بند کرنے کا حکم دینے والے وہی لوگ ہیں جو ایوب خان اور یحییٰ خان کی بدترین آمریت کے عہد کو عہدِ زریں کا نام دیتے تھے اور اپنے ہر پروگرام میں ان آمروں کو زیادہ سے زیادہ مسکہ لگا کر اپنی ملازمتوں کو پکا کرتے تھے اور نئی ترقیوں کی راہ نکالتے تھے۔ اب یہی افراد بھٹو حکومت میں ترقی پسند بن گئے ہیں ——— جمہوریت .... مساوات اور .... آفتابِ تازہ کی نوید دیتے ہیں۔ مگر اندر سے اتنے مکروہ اور درندہ صفت ہیں کہ ایک بے سہارا، معذور فنکار کے لیے اپنی "جاگیر" کا دروازہ بند کر دیا۔

قوم کو اس اندھیر گردی سے جانے کب نجات ملے گی ....؟

SIND GOVERNOR'S SECRETARIAT
KARACHI

No. G.S/ 2 /72(SO-II)/ 3164

Dated 19th February, 1972

To,

The Regional Manager,
Radio Pakistan,
Karachi

I am desired to attach herewith in original a petition dated the 15th Feb: 1972 which was presented personally by a blind man Amir Ahmed at the Sind Governor's House. He says that he is an old artist of Radio Pakistan.

It is requested that his case may kindly be given due consideration.

(M. A. Waheed) T.K
Section Officer-II
for Secretary to Governor, Sind

Copy to Mr. Amir Ahmed Hafiz, c/o Abdur Rauf Khan Hussaini, F.S. 8/9, near Jinnah Square, Malir Extention Colony, Karachi-No.37, for information

(M. A. Waheed) T.K
Section Officer-II

سندھ سیکرٹریٹ کی ہدایات کے باوجود امیر احمد کو پروگرام نہیں دیئے گئے

روٹی، کپڑا اور مکان

قاسم عثمانی

نام تو نہ جانے اس کا کیا تھا لیکن لوگ اس کو انقلابی کہہ کر پکارتے تھے وہ گھنٹوں سڑک پر کوئلے سے تصویریں بناتا رہتا۔ پہلے وہ ایک ایسے جانور کی تصویر بنایا کرتا تھا جس کی دو ٹانگیں ہوتی تھیں۔ پھر اس نے وہ تصویر بنانا چھوڑ دی۔ اور اس کی جگہ کئی مہینوں تک کبھی طلوع ہوتے ہوئے سورج اور کبھی چراغوں کی تصویریں بناتا رہا۔ پھر اس نے ان تصویروں کو بھی بنانا چھوڑ دیا۔ اب ادھر کئی دن سے وہ کبھی لہلہاتے کھیت کے سامنے کشکول لیے ہوئے فقیر کی تصویر بنا کر اس کو مٹاتا اور پھر اس کی جگہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی عورت کے سامنے کسی رئیس زادی کی تصویر بنا دیتا اور پھر اس کو بھی اپنی قمیض کے میلے دامن سے صاف کرکے اس کی جگہ ایک جھونپڑی کے سامنے ایک خوبصورت مکان کی تصویر بنا دیتا۔ جب لوگ اس کی بنائی ہوئی ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تو وہ ان کی طرف دیکھ کر جلدی سے پاس رکھی ہوئی سرخ پوٹلی کو اٹھا کر چھپا لیتا۔ لوگ پوچھتے —— "انقلابی اس پوٹلی میں کونسا خزانہ ہے جو تم اس کو چھپا لیتے ہو؟" —— تو وہ ان لوگوں کی طرف ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر سر جھکا لیتا۔

ایک دن جب لوگ سڑک سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ انقلابی نے آج کوئی تصویر نہیں بنائی ہے بلکہ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے —— "لوگو! میں نے اپنے وجود کی مسافتوں میں بڑے دکھ جھیلے ہیں، بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں، میرا بدن لہولہان ہے۔ میں اپنے اندر بھٹکتے تھک گیا ہوں... دیکھو میں نے اپنی ذات کے موتیوں اور مونگوں کو اس طرح بکھیر دیا ہے کہ ہر کوئی ان کو آسانی سے ٹٹول سکے۔ چند امیدیں مجھے بار بار ایسے اکساتی ہیں جیسے بغیر بارش کے بدلیاں... اور میری ان امیدوں کا دم بھی آہستہ آہستہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ دیکھو وہ سامنے عظیم الشان بنگلے کے پیچھے ویران جھونپڑے، کملائے ہوئے انسان اور اداس گلیاں... وہاں دن کو بھی رات ہوتی ہے۔ تم وہاں کسی کا قہقہہ نہ سنو گے۔ کسی کو مسکراتے نہ دیکھو گے اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک تم خاموش ہو۔ اٹھو اٹھو.. اے زندگی کے سفر سے اکتائے ہوئے تھکے ماندے مسافرو اٹھو... اٹھو اپنے زخموں کا انتقام اس بورژوا سماج سے لے لو جو اس نے تم کو لگائے ہیں —— لے لو —— لے لو —— ان تلخیوں کا انتقام جو بورژوا تہذیب نے تمہاری روح میں گھول دی ہیں"، اتنا کہہ کر اس نے خود تالیاں بجائیں اور خاموش بیٹھ گیا۔

دوسرے دن جب لوگ انقلابی کے پاس سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ خاموش بیٹھا خلاء میں گھور رہا ہے۔ ایک شخص نے رک کر پوچھا کیا بات ہے؟ انقلابی نے آج کوئی تصویر نہ بنائی —— "جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔" انقلابی گھمبیر آواز میں بولا —— اور ایک دن سڑک پر شور مچ گیا کہ انقلابی تصویر بنا رہا ہے لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس نے سڑک پر ہل، کھیت اور مکان کی تصویر بنا رکھی ہے اور اس کے سامنے وہ مسلسل مفلوک الحال لوگوں کی تصویریں بنائے چلے جا رہا ہے۔ جب سڑک کا ایک حصہ ان تصویروں سے بھر گیا تو وہ اور تصویریں بنانے کے لیے سڑک پر آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر اس کو کچلتی ہوئی نکل گئی۔ لوگ بھاگ کر اس کی لاش کے پاس پہنچے۔ اس کو وہاں سے اٹھایا اور لا کر سڑک پر رکھ دیا۔ ایک شخص نے سڑک پر پڑی ہوئی پھٹی پرانی چادر جو کسی زمانے میں سرخ رہی ہو گی اس پر ڈالنے کے لیے اٹھائی تو اس چادر کے نیچے سے وہی سرخ پوٹلی نکلی۔ اس نے اس کو اٹھا کر کھولا تو اس میں سے ایک پرچہ نکلا۔ جب اس نے اس کو پڑھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس پر صرف —— "روٹی —— کپڑا —— اور مکان" ہی لکھا ہوا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اس پرچے اور انقلابی کی لاش کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے وہ پرچہ اس کی لاش کے پاس ڈالا اور —— "پاگل تھا بے چارہ" کہتا ہوا چلا گیا۔

پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے مالکان اساتذہ کو تنخواہ نہ دیں گے

اعلان کے ساتھ ہی حکومت نے

تعلیمی اداروں کو اپنے کنٹرول میں کیوں نہیں لیا؟

بدر السّلام

تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں سب سے پہلے سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت نے فوری طور پر اعلان کے ساتھ ہی تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں کیوں نہیں لے لیا جس طرح کہ صنعتی اداروں کو لیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تعلیمی ادارے حکومت کی جانب سے چونکہ منافع کی بنیادوں پر نہیں چلائے جاتے۔ دوسرے اتنے بڑے اخراجات کے لیے بجٹ میں گنجائش اس سال رکھنا مشکل تھی۔ ایسی صورت میں حکومت کے لیے مستحسن ہوگا کہ تعلیمی پالیسی کا اعلان سال کے درمیان میں نہ کیا جاتا بلکہ تعلیمی سال کے اختتام کے قریب یہ اعلان کرکے فوری طور پر کالجوں اور جملہ تعلیمی اداروں کا ریکارڈ تحویل میں لیا جا سکتا تھا۔ سال کے درمیان میں حکومت کے تعلیمی پالیسی کے اعلان سے اساتذہ کو بہت سے نقصانات اٹھانا پڑیں گے جن میں سے بنیادی نقصان مالی ہوگا۔

پھر جس طرح زرعی اصلاحات کے اعلان کے وقت مارشل لاء کا آرڈی نینس جاری کیا گیا ہے اس نوعیت کا کوئی آرڈی نینس، کوئی ضابطہ جو کالجوں کی پیرینٹ باڈیوں کو تنخواہوں وغیرہ کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں سزا وار ٹھہراتا۔ ایسے کسی ضابطے کی عدم موجودگی کے سبب تعلیمی اداروں کے مالکان آئندہ چھ ماہ تک کسی قسم کے واجبات کی ادائیگی سے معذوری ظاہر کریں گے۔ کیونکہ بزعم خود یہ سرسید اب کالجوں سے جتنا زیادہ سے زیادہ ممکن ہوگا پیسہ کھینچنے کی کوشش کریں گے۔

اس عرصہ میں کالجوں کی انتظامیہ اور مالکان کالجوں سے ایسے تمام ریکارڈ تلف کر دے گی کہ جن کی بنیاد پر ان بدکردار لوگوں کا احتساب ہو سکتا ہو۔ چنانچہ جس وقت حکومت انتظام سنبھالے گی تو کالجوں میں سوائے ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور خالی بلڈنگ کے کچھ نہیں رہ جائے گا۔ ایسی صورتِ حال میں ہر تعلیمی ادارے میں کام کرنے والے اُستاد کا فرض ہے کہ وہ مالکان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے اور حکومت کے ذمہ دار افسران کو مطلع کرتا رہے۔

قومیانے کے تصوّر کے بارے میں ہمیشہ دو آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک سرمایہ دارانہ اور استحصالی ذہن رکھنے والے جو یہ کہتے ہیں کہ ذاتی ترغیب کے بغیر کوئی کاروبار ترقی نہیں کر سکتا۔ اور دوسرا تصور ملک کے عظیم تر مفاد میں نجی ملکیتوں کو قومیانے کا ہے۔ اس روشنی میں دیکھا جانا چاہیئے کہ آیا واقعی تعلیمی ادارے بھی صنعتی اداروں کی طرح ہیں جہاں مالکان کو بے پناہ منافع ہوتا ہے تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا اور اس کے لیے کسی لمبے چوڑے فلسفیانہ اور مدلل جواب کی بجائے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ کیا بات ہے کہ اے ایم قریشی ۲۴ سال سے ایک تعلیمی ادارہ اسلامیہ کالج چلاتا ہے جس میں سالانہ لاکھوں کا نقصان ہوتا ہے لیکن اسے ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے اور جیسے ہی اساتذہ کی خواہش پر بورڈ آف گورنرز بنایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کالج نقصان میں چل رہا ہے۔ وصول شدہ فیسوں سے اساتذہ کو تنخواہیں بھی نہیں دی جا سکتیں۔ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ اور کیا واقعی تمام تعلیمی وڈیرے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر قوم کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے بلکہ یہ صرف اکاونٹنٹ کے ہاتھ کی صفائی ہے جو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بناتا ہے

کالجوں کی مالی حیثیت

پورے مغربی پاکستان میں نجی تعلیمی اداروں کی سب سے بڑی تعداد لاہور میں ہے۔ لاہور میں دیال سنگھ کالج، ایم اے او کالج، ایف سی کالج اور انجمن حمایت الاسلام کے تحت چلنے والے کالجوں کی حالت اطمینان بخش ہے۔ ان میں سے ہر ایک کالج کافی پرانا ہے اور سب کالجوں کے ٹرسٹ ہیں اور جائیدادیں ہیں۔ انہیں بھی حکومت اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ کراچی کو چھوڑ کر اندرونِ ملک تعلیمی اداروں کی حیثیت اتنی خراب نہیں ہے کیونکہ ان علاقوں میں نجی کالج کھولنے کی اجازت بڑی مشکل سے ملتی ہے اور فکس ڈپازٹ بہت زیادہ رکھنا پڑتا ہے۔

کراچی میں اندازاً ۴۵/۴۶ کالج نجی ہیں۔ ان کالجوں میں سے بیشتر کی اپنی عمارتیں ہیں۔ ان عمارتوں کو بھی بغیر کسی معاوضے کے لینے میں حکومت بالکل حق بجانب ہو گی۔ کیونکہ لاکھوں روپے مالیت کی یہ زمین جن پر کالج کی عمارتیں قائم ہیں حکومت نے بعض صورتوں میں برائے نام قیمت لے کر عطا کی تھیں اور ان کالجوں کی عمارتوں کی تعمیر میں اساتذہ کا عطیہ، طلبا اور طالبات کا عطیہ، بیرونی عطیات اور حکومت کی ڈیولپمنٹ گرانٹ شامل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان بلڈنگوں کو بلامعاوضہ قومیانے میں حکومت حق بجانب ہو گی ——— !

کراچی کے کالجوں کے منتظمین کبھی بھی کالج کو اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں کرتے۔ لاکھوں روپے سالانہ کی بچت کو کاغذی ہیر پھیر میں گم کر کے اپنی جیبوں میں ڈال لیا جاتا ہے اور اگر ماضی میں کبھی کسی حکومت نے کسی ایک ادارے کو اپنی نگرانی میں لینا چاہا تو مالکان الگ ہو کر حکومت کی بے بسی کا تماشا دیکھتے رہتے تھے گویا کہہ رہے ہوں ——— "اب چلا کر دکھاؤ؟ ... یہ تو ہم ہی چلا سکتے ہیں!" اور مجبوراً حکومت پھر اسی مالک کو ادارہ لوٹا دیتی تھی۔ ... خدا کرے اب ایسا نہ ہو!

نجی کالجوں میں تعلیم کا معیار گر رہا ہے

نجی کالجوں میں اساتذہ کا بیشتر وقت یا تو مالکان سے اپنی تنخواہوں کی وصولیابی کی کوششوں میں گزر جاتا ہے یا پھر آپس کی ایسی دھڑے بازیوں میں کہ کون مالک کے قریب ہو کر تنخواہوں میں اضافہ کرا سکتا ہے اور دوسرے کھانے کمانے کے ڈھنگ نکال سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اساتذہ کا علمی معیار روبہ تنزّل ہے اور اسی بے اطمینانی کے سبب وہ طلباء کو مناسب طور پر پڑھا بھی نہیں سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیونکہ نجی کالجوں میں لڑکوں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

(۱۰) دس لاکھ ٹائپسٹ

مالکان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے گئے ہیں

یوسف گوڈیل شفاؔ

برِصغیر پر انگریزی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی وہاں کے مسلمانوں اور دیگر اقوام کی صلاحیتوں کو مفلوج کرنے اور انہیں ناکارہ بنانے کے لئے جو اقدامات عمل میں لائے تھے ان میں ایک قدم یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو ایسا کام سکھایا جائے جو اُن کے ارتقاء کی منزلیں طے نہ کرا سکے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ ایسے عمیق غار میں پھنسے رہیں۔ جہاں سے وہ صدیوں تک نکل نہ سکیں۔ انگریزوں کے اس پُر فریب جال میں ہندوستان کے وہ لوگ بھی آ گئے جن کا اپنا ایک مقام تھا۔ مگر غلامی کی زنجیروں نے انہیں بھی ذلت و رسوائی کے غار میں ڈھیل دیا۔ ان لوگوں میں ہندوستان کے بڑے بڑے نواب اور علماء و فضلاء اور رُوساء بھی شامل تھے۔ انگریز اپنی چال میں کامیاب ہو گیا اور اُس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک معمولی کلرک بنا کر رکھ دیا۔

تیرہ برس تک آمروں کی حکومت کے بعد موجودہ حکومت نے مزدوروں کے لئے لیبر پالیسی بنائی ہے۔ کسانوں کے لئے زرعی اصلاحات جاری کیں ـــــ لیکن متوسط طبقہ آج بھی عزت کی خاطر اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہے۔ جب مزدوروں کو مراعات ملتی ہیں تو انہیں آفیسر کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے اور جب آفیسروں کو مراعات ملتی ہیں تو انہیں مزدور کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اس ملک میں متوسط طبقہ سب سے اعلیٰ طبقہ شمار ہوتا ہے۔ اس طبقہ میں ۹۹ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ اس طبقے نے کبھی ظلم کے خلاف ہتھیار یا آواز نہیں اٹھائی بلکہ مزید پتھر اپنے پیٹ پر باندھ کر زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ اس طرح کسی کمپنی کو چلانے کے آفس قائم کرنے پڑتے ہیں اس طرح اس کمپنی کے ریکارڈ اور فائلوں کو بنانے کے لئے ٹائپسٹ رکھے جاتے ہیں تاکہ جو کام ہو رہا ہے اس کا باقاعدہ ٹائپ شدہ ریکارڈ رکھا جائے اور وقت ضرورت اس کو دیکھا جائے۔ ہمارے ملک میں ہر کمپنی اپنے دفتروں میں دو چار ٹائپسٹ مقرر کرتی ہے اور بعض کمپنیاں ایسی ہیں جہاں ٹائپسٹوں کے بغیر کمپنی کوئی کام نہیں کر سکتی۔ ہر کمپنی جب ٹائپسٹوں کا تقرر کرتی ہے تو اس کی قابلیت تجربہ اور کارکردگی اور ٹائپسٹ کی رفتار کو مدِنظر رکھتی ہے۔ مگر مفاد پرست۔ اور خود غرض لوگ کسی کی قابلیت، تجربے یا کارکردگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے اتنی قلیل تنخواہ کی پیش کش کرتے ہیں جو ایک اچھے اور قابل ٹائپسٹ کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ مگر مالی پریشانی، ملک کے دگرگوں حالات گھریلو پریشانیوں اور بے روزگاری کو مدِنظر رکھتے ہوئے بے کار سے بے گار بھلا کے مترادف وہ وقتی طور پر قبول کر لیتا ہے! ایسے حالات میں مفاد پرست لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے آٹھ گھنٹے کی بجائے بارہ گھنٹے کام لیتے ہیں اور اُجرت اتنی نہیں دیتے کہ وہ بڑی مشکل سے دو وقت سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کر سکا۔

اب اس ملک پر ظالم حکمران یا بھیڑیے حکومت نہیں کر رہے بلکہ اب عوام کے وہ منتخب نمائندے ہیں جو صحیح معنوں میں حکمران کہلانے کے مستحق ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ "قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے"۔ اب تک موجودہ حکومت نے جو کام کئے ہیں وہ ملک و قوم اور عوام کی بھلائی کے لئے کئے ہیں۔ کسی کام کو کرنے کے لئے وقت درکار ہے اور موجودہ حکومت نے اِس قلیل وقت میں جو اصلاحات نافذ کی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں مگر جب تک کسی برائی کو جڑ سے ختم نہ کیا جائے برائی ختم نہیں ہو سکتی۔ اب اس معاشرے میں اَن گنت برائیاں اپنے وسیع دامن پھیلائے ہوئے ہیں اِس وسیع دامن کو تار تار کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے مگر مخلص اور بے لوث خدام اگر چاہیں تو یہ کام بہت قلیل عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

حکومت نے مزدوروں کے لئے لیبر پالیسی کا نفاذ کیا ہے۔ مگر اس پالیسی میں ملک کے دس لاکھ ٹائپسٹوں اور اسٹینو گرافر کے لئے کوئی اسکیل پیش نہیں کیا گیا جو اُن کا مستقبل بنا سکے۔ ہر کمپنی اور ادارے کا اپنا بنایا ہوا اسکیل ہے۔ جو اُن کے اپنے ذاتی مفاد اور ادارے کے مفاد سے تعلق رکھتا ہے مگر اس میں ٹائپسٹوں کا کوئی مفاد نہیں۔ لہٰذا میں حکومت پاکستان سے اپیل کرتا ہوں کہ ذیل میں دیے گئے اسکیل اور مراعات پر غور کرے اور نفاذ کا حکم جاری کرے۔ ان کا اطلاق ان تمام ٹائپسٹوں پر ہو جو اس ملک میں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ملازم ہیں۔

مرقومہ اسکیل کی روشنی میں ساتھ ساتھ یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ اگر ایک ٹائپسٹ کی رفتار ۶۰ الفاظ فی منٹ ہے۔ ایسی صورت میں اس کی کارکردگی اور رفتار کو مدِنظر رکھتے ہوئے ۱۰۰ روپے کا رفتار الاؤنس مقرر کیا جائے کیونکہ بعض ٹائپسٹ مالی حالات کے پیشِ نظر تعلیم جاری رکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مگر ان کی کارکردگی قابلِ رشک ہوتی ہے ایسی صورت میں ان کی قابلیت اور کارکردگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے لئے الاؤنس مقرر کئے جائیں۔

مرقومہ اسکیل کے ساتھ ان کو وہ تمام مراعات دی جانی چاہیئے جو کسی ادارے میں مزدوروں اور آفیسروں کو

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

اسکیل ٹائپسٹ اور اسٹینو گرافرز

(۱) میٹرک پاس ٹائپسٹ	اسکیل	۲۰۰—۱۰—۳۰۰۔	رفتار ٹائپ	۳۰ الفاظ فی منٹ
(۲) میٹرک پاس اسٹینو گرافر ٹائپسٹ	اسکیل	۲۲۵—۱۰—۴۰۰۔	رفتار ٹائپ	۳۰، ۶۰ فی منٹ
(۳) انٹر پاس ٹائپسٹ	اسکیل	۲۱۵—۱۰—۳۵۰۔	رفتار ٹائپ	۴۰ فی منٹ
(۴) انٹر پاس اسٹینو ٹائپسٹ	اسکیل	۲۵۰—۱۰—۴۵۰۔	رفتار ٹائپ	۴۰۔۸۰ فی منٹ
(۵) گریجویٹ ٹائپسٹ	اسکیل	۳۰۰—۱۵—۴۵۰	رفتار ٹائپ	۴۵ الفاظ فی منٹ
(۶) گریجویٹ اسٹینو ٹائپسٹ	اسکیل	۳۵۰—۱۵—۵۰۰	رفتار ٹائپ	۴۵۔۱۰۰ الفاظ فی منٹ
(۷) ایم اے ٹائپسٹ	اسکیل	۴۰۰—۲۰—۶۰۰	رفتار ٹائپ	۵۰ الفاظ فی منٹ
(۸) ایم اے اسٹینو گرافر	اسکیل	۴۵۰—۲۵—۷۰۰	رفتار ٹائپ	۶۰۔۱۲۰ الفاظ فی منٹ

خیبر سے کیماڑی تک

لائلپور

ورکشاپوں کے منتظمین کاریگروں پر ظلم کرتے ہیں

نمائندہ الفتح

گزشتہ ہفتے پریس کلب میں ایگریکلچرل انجینئرنگ ایمپلائز یونین کے صدر مسٹر محمد سلیم خان نے صحافیوں سے بات چیت کے دوران بتایا کہ بہاول پور، ملتان، لیہ، لاہور اور پنڈی کے عہدیداران نے متفقہ طور پر لائل پور ایگریکلچرل ایمپلائز یونین رجسٹرڈ کے ساتھ الحاق کے معاہدے کو آخری شکل دے دی ہے۔ آپ نے کہا کہ اجلاس میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مذکورہ یونینوں کے تمام مسائل لائل پور کی یونین کی وساطت سے حل کیے جائیں گے۔ آپ نے صدر مملکت اور گورنر پنجاب سے اپیل کی کہ ایگریکلچرل انجینئرنگ ایمپلائز یونین کے پیش کردہ مطالبات کو فوری تسلیم کیا جائے اور مزدوروں کو درپیش مشکلات کا ازالہ کیا جائے۔

یونین نے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے ہیں۔

(۱) عبوری الاؤنس مارچ ۱۹۶۹ء سے دیا جائے جو تاحال نہیں ملا۔

(۲) محکمۂ ایگریکلچرل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے تمام ملازمین جو روزانہ اُجرت پر کام کرتے ہیں ان کو موجودہ تنخواہ پر باقاعدہ کیا جائے۔

(۳) اے ایم او لیہ کے ورک چارج ملازمین کو ریگولر کیا جائے نیز حسب وعدہ اراضی کی الاٹمنٹ کی جائے جس کا کیس سابقہ گورنر پنجاب کے وقت سے چل رہا ہے۔

(۴) اکتوبر ۱۹۶۴ء سے جن ملازمین کو بغیر نوٹس سے نوکری سے برخاست یا برطرف کر دیا گیا تھا انہیں بحال کیا جائے اور سابقہ بقایا جات ادا کیے جائیں۔

(۵) تمام ایگریکلچرل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے ملازمین کے لیے خصوصی طور پر راشن ڈپو کا انتظام کیا جائے۔

(۶) ہیڈ آفس سے جو آرڈر ڈائرکٹر کے حکم سے جاری ہوں وہ تمام محکمہ کی یونٹوں میں لاگو ہونے چاہئیں

دریں اثنا پاکستان مزدور کسان پارٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر غلام نبی کلّو نے ایگریکلچرل انجینئرنگ ایمپلائز یونین کے پیش کردہ مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہوئے کہا کہ زرعی انجینئرنگ پاکستان میں مشینی کھیتی باڑی کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ مگر زرعی انجینئرنگ کی ورکشاپیں جو ملک بھر میں قائم ہیں صرف نوکر شاہی کی خوشنودی کے لیے کام کر رہی ہیں اور ان میں کام کرنے والے کاریگروں کو بلا نوٹس علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ مگر احتجاج پر بھی اعلیٰ حکام نے کوئی کان نہیں دھرا۔ آپ نے کہا کہ زرعی انجینئرنگ ورکشاپ لائل پور، لاہور، ساہی وال، ملتان سرگودھا، رحیم یار خان اور لیہ میں قائم ہیں اور وہیں کاریگروں نے اپنی اپنی یونینیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔ جن کا الحاق مغربی پاکستان زرعی انجینئرنگ ایمپلائز یونین لائل پور سے ہے مسٹر غلام نبی کلّو نے کہا کہ گزشتہ سال ان کے ۱۲ مطالبات تسلیم بھی کر لیے گئے تھے مگر اب تک ان پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ ورکشاپوں کے منتظمین کاریگروں پر تشدد کرتے ہیں اور ان کی توہین کرنا ان کا معمول بن چکا ہے۔ ورکشاپوں کے لیے کروڑوں روپے کے فنڈ مخصوص ہیں مگر وہ بڑے بڑے افسران کے استعمال میں ہی آتے ہیں۔ ورکشاپوں میں ڈسپنسری اور کنٹین کا وجود نہیں پایا جاتا۔ آپ نے کہا انجینئرنگ ورکشاپوں کے ملازمین کو رہائش کی سہولتیں بھی فراہم نہیں کی جاتیں۔ افسران متعلقہ اعلانیہ یہ کہتے ہیں کہ کسی کا کوئی قانون ان ورکشاپوں پر لاگو نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی فیکٹری ایکٹ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے کہا دلچسپ امر یہ ہے کہ زرعی انجینئرنگ کی ورکشاپیں صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں کام کرتی ہیں۔ محکمۂ زرعی انجینئرنگ کا سیکرٹری اور صوبائی گورنر ان کا کنٹرول کرتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ تمام مراعات جو دوسرے کارخانوں میں عام مزدوروں کو دی جاتی ہیں زرعی انجینئرنگ کے مزدور ان سے محروم ہیں۔ آپ نے کہا شاید نئی لیبر پالیسی میں بھی مذکورہ ادارہ کے ملازمین سے متعلق وضاحت نہیں کی گئی۔ مسٹر کلّو صاحب نے کہا کہ گزشتہ دنوں پنجاب کی تمام ورکشاپوں کے کاریگروں کے ایک مشترکہ اجلاس میں جو مراعات دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ عام مزدوروں کو پہلے ہی سے حاصل ہیں۔ آپ نے کہا۔ کیا مرکزی اور صوبائی حکومتیں جو آئے دن مشینی کھیتی باڑی کا ذکر کرتی رہتی ہیں اس طرف بھی کوئی توجہ دینے کی زحمت گوارا کریں گی۔

مطالبہ مستقل آبادکاری

ہم باشندگانِ فرقان آباد (دولت رام ملز ایریا) بیس سال سے بلدیہ کراچی کے اس پلاٹ پر جھگیوں میں حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم مزدور پیشہ نچلے طبقے کے لوگ قریبی سبزی و فروٹ مارکیٹ و قریبی فیکٹریوں کارخانوں مثلاً حبی سنز بلب فیکٹری، فونکس ملز، سندھ چاکلیٹ فیکٹری، کراچی ملک پلانٹ، پاکستان گورنمنٹ پریس، ٹیلیفون ایکسچینج وغیرہ میں محنت مشقت کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمارے بچے قریبی اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں مہربانی فرما کر ہم لوگوں کو اسی پلاٹ پر محنت مشقت اور ملازمت وغیرہ کی جگہوں کے قریب مستقل طور پر آباد کیا جائے۔ ہم لوگ مناسب قیمت اقساط کی صورت میں ادا کرنے کو تیار ہیں۔ علاقہ کی الفرقان ہاؤسنگ کواپریٹو سوسائٹی کے ذریعے ہماری آبادکاری کا مسئلہ حل کیا جائے۔

فرقان آباد فلاح و بہبود سوسائٹی
(دولت رام ملز ایریا) کراچی۔

جان علی کا چچا دوا کے بغیر چل بسا

احتشام زرین فاروقی

ایک صحت مند معاشرہ وہ معاشرہ ہوتا ہے کہ جس میں مسائل کم سے کم ہوں۔ اس کے برعکس ایک غیر صحت مند یا غیر ترقی یافتہ معاشرہ اس کو کہتے ہیں جس میں معاشرے میں بسنے والے افراد بے پناہ مصیبتوں اور پریشانیوں سے دوچار رہتے ہوں۔ ہمارا معاشرہ بھی غیر صحت مند ہے۔ زندہ رہنے کے لئے روٹی درکار ہوتی ہے اور ہمارے یہاں اکثریت روٹی حاصل کرنے کے لئے زبردست جدوجہد کرتی ہے۔ دن رات اسی کوشش میں لگی رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بھوک مٹا سکے۔ لیکن مسلسل جدوجہد کے بعد بھی پوری روٹی ہاتھ نہیں آتی اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو کوئی جینے کا سہارا نہیں ملتا اور وہ جھونپڑیوں، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر دھیرے دھیرے سسک کر مرجاتے ہیں اور پھر اخباروں میں خبر آتی ہے۔ "ایک نامعلوم شخص کی لاش فلاں جگہ پائی گئی۔ رپورٹ درج کرنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا۔" ایسی خبروں پر ہم دھیان نہیں دیتے اور شاید اس لئے کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں یا یہ کہ ہم سوچنے کی زحمت کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہمیں تو مزے دار خبروں کی تلاش ہوتی ہے تاکہ دوسروں کو سنائیں اور تفریح کے طور پر بحث کریں۔

کبھی کبھی جاڑے کی راتوں میں کوئی سردی سے ٹھٹھر جاتا ہے اور اکثر گرمیوں کی تیز چلچلاتی دوپہر میں کوئی غریب کسی راستے پر بے ہوش ہو جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو کوئی ہسپتال نہیں لے جاتا اور اگر کوئی اللہ کا نیک بندہ اُسے ہسپتال پہنچا بھی دیتا ہے تو وہاں والے داخل نہیں کرتے اور اگر بھولے سے کر بھی لیتے ہیں۔ تو صحت یاب ہونے سے پہلے نکال دیتے ہیں، اس لئے کہ ان کے پاس جگہ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اسٹاف نہیں ہوتا اور اگر جگہ اور سٹاف دونوں ہوتے ہیں تو احساس، مروّت اور اپنے پیشے سے وفا کا جذبہ نہیں ہوتا۔

کافی دن پہلے کی بات ہے کہ ایک طالبہ جل گئی تھی۔ بڑی نازک حالت میں اس کو سول ہسپتال لے جایا گیا۔ لیکن وہاں سے جواب ملا کہ جگہ نہیں ہے۔ وہ بے چاری تڑپتی رہی لیکن مسیحاؤں کو اس کا احساس کب ہے۔ اس کے علاوہ اکثر پرائیویٹ ڈاکٹر صاحبان رات کے وقت مریضوں کا معائنہ کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ چاہے مریض کی حالت کتنی ہی بری ہو۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر لوگوں کو نہ تو غذا ملتی ہے اور نہ ہی دکھ درد میں دوا دارو۔

جان علی عمر کوٹ کا رہنے والا ہے۔ باپ کے مرجانے

وہ نو میل کا چکر

کاٹتا ہے تو اسے

دو روپے ملتے ہیں

کے بعد وہ اپنے چچا کے پاس جو میرپور خاص میں رہتا تھا چلا گیا۔ وہاں اس کا چچا مٹی کی بنی ہوئی صراحیاں اور مٹکے بیچتا تھا۔ جان علی بھی اس کے ساتھ کام کرنے لگا۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کا چچا بیمار پڑ گیا۔ اُس نے کراچی کے بارے میں سنا تھا کہ بہت بڑا شہر ہے۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ کراچی چلا جائے وہاں اس کے چچا کا علاج بھی ہو جائے گا اور اس کو کوئی اچھا کام بھی مل جائے گا۔ یہاں آکر لوگوں سے اُس نے کسی ہسپتال کے بارے میں پوچھا تو کسی نے اس کو ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے یہاں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر نے اپنے دواخانے سے چار پانچ روپے کی دوا دی اور باہر کی دوا بھی لکھ کر دی۔ جان علی کو جب دوا فروش نے دوا کی قیمت بتائی تو اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ خرید سکے اور نہ ہی اس میں اتنی سکت تھی کہ وہ ڈاکٹر کے پاس پھر جاتا اور چند روز بعد روایت کے عین مطابق اس کا چچا بھی علاج نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دنوں بعد مر گیا۔ نہ جانے ایسے کتنے ہی لوگ دن رات مرتے رہتے ہیں۔ کچھ آرام سے بستروں پر چل بستے ہیں اور کچھ اسی طرح مرجاتے ہیں۔

جان علی جب سے آیا ہے یہیں کراچی میں ماری پور کے پاس رہتا ہے۔ اس کے رشتے دار وہیں اس کے اپنے پرانے شہر عمر کوٹ میں رہتے ہیں۔ اُس نے یہاں بھی وہی کام شروع کر دیا ہے جو وہ پہلے کرتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ صراحی مٹکے بجاتا ہوا گلی گلی پھرتا ہے اور اگر حساب لگایا جائے تو وہ یقینی طور پر آٹھ نو میل پیدل چلتا ہے اور جب واپس لوٹتا ہے تو اُس کے پاس ڈھائی تین روپے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے "زیادہ لوگ دام کم کراتا ہے۔ کوئی کوئی آدمی ایسا ہے، جو ٹھیک پیسے دیتا ہے۔" اس کو جتنے بھی پیسے ملتے ہیں۔ وہ ان میں سے بہت کم خرچ کرتا ہے اور باقی پیسے جمع کرتا ہے۔ وہ واپس اپنے شہر جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی حالت وہی ہے جو پہلے تھی۔ اس کے معاشی حالات جوں کے توں ہیں۔ وہ سات آٹھ گھنٹے صرف کر کے آٹھ نو میل کی مسافت طے کرتا ہے اور اس محنت کا صلہ زیادہ سے زیادہ تین روپے روز ملتا ہے۔ جب کہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا نوجوان چند گھنٹوں کی تفریح میں پانچ چھ روپے صرف چائے اور سگریٹ پر صرف کر دیتا ہے۔ اور چار پانچ روپے گاڑی کے پٹرول یا ٹیکسی کے کرائے میں خرچ کر دیتا ہے۔ لیکن اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کی روز کی آمدنی تین یا چار روپے سے زیادہ نہیں۔

بھٹو صاحب

نیا پاکستان بنا رہے ہیں

ارشد خان

پاکستان —— جسے بنانے کے لیے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ پاکستان کو ایک حقیقت کا روپ دینے کے لیے لاکھوں بہنوں نے اپنی عصمتوں کے موتی لٹا دیئے۔ پاکستان —— جسے ایک ملک کی شکل دینے کے لیے باپوں نے اپنی جوان اولادیں قربان کر دیں۔ جس پاکستان کی تعمیر کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے مقدس لہو کا عظیم ترین تحفہ دیا —— اپنے خون سے لالہ زار کر کے ایک نئے ملک کو کرۂ ارض پر ابھارا ایک آزاد ملک — ایک آزاد پاکستان —— سوچا تھا ہم وہاں صحیح معنوں میں آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ آزاد پاکستان کی خوشگوار فضا میں آزادی کا لذت بخش سانس لیں گے —— پاکستان —— جہاں اپنی تہذیب اور تمدن ہوگا، اپنی ثقافت ہو گی، اپنی علیحدہ طرزِ زندگی ہو گی جہاں اسلام کے اصولوں کی روشنی میں ہم اپنی اہمیت دُنیا سے منوالیں گے —— ایک خوشحال پاکستان —— جہاں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ہر شخص کو ترقی کے برابر مواقع میسّر آئیں گے —— لیکن یہ خوبصورت سپنا بکھر گیا قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی نیاؔ بھنور میں پھنسنے لگی۔ اقتدار کی کشمکش تیز تر ہوتی گئی۔ یکے بعد دیگرے ایسے لیڈر ابھرے جنہیں ملک سے زیادہ اپنا مفاد عزیز رہا —— اور چاروں طرف سے سیاہ بادل گھرے اور تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء ملک کا سب سے تاریک ترین دن تھا جب جنرل ایوب ملک پر قابض ہوا اور مسلسل تیرہ برس تک اس جنرل نے اپنی من مانی کی —— پھر اس مہیب تاریکی میں ایک ستارہ چمکا، بڑا ہی روشن! اس کی روشنی غریبوں کے جھونپڑوں میں پھیلی تو ان کے چہرے جگمگا اٹھے۔ ان کے پژمردہ چہروں پر مسکراہٹ کے پھول کھلے۔ ان کے سوکھے ہوئے جسموں میں گویا خون گردش کرنے لگا —— غریبوں کی آس، مزدوروں کی امید، کسانوں کا سہارا، بیماروں کا مسیحا، طالب علموں کا ارمان، دانشوروں کا ساتھی —— قدرت نے اس کے کندھوں پر ایک عظیم ذمہ داری ڈال دی۔ غریبوں کی دلداری کے لیے اللّٰہ نے اسے منتخب کیا۔ تب بھٹو صاحب میدانِ عمل میں نکل پڑے۔ ایئر کنڈیشن بنگلوں میں نرم صوفوں پر بیٹھ کر انہوں نے غریبوں کی ہمدردی میں محض بیان جاری نہیں کیے بلکہ وہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گئے۔ ایک ایک در پر دستک دی۔ انہوں نے چلچلاتی دھوپ اور گرمی میں غریبوں کے جسموں سے بہتا ہوا پسینہ دیکھا۔ ان کی جان فشانی اور سخت محنت دیکھی۔ سخت محنت کے باوجود ان کو پیٹ بھر روٹی نصیب نہ ہوتی تھی تو بھٹو صاحب تڑپ اٹھے اور تب انہوں نے آمریت کو للکارا تو ساری قوم ان کی ہمنوا بن گئی۔ وہ غریبوں کی آواز بن کر اُٹھے۔ تلوار کی طرح چمکے اور آمریت کے بُت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ لیکن یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ آمروں نے ہمیں اپنے ملک کے ایک حصے سے محروم کر دیا۔ مَیں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں ایک پاکستان قائدِ اعظم نے بنایا تھا اور اب دوسرا بھٹو صاحب بنا رہے ہیں۔

جو وقت ہمارے ملک پر گزر گیا وہ بہت المناک تھا اور اسے بھُول جانا ہی بہتر ہے اور بقول بھٹو صاحب ہمیں نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے دل و جان سے کام کرنا چاہیئے —— مَیں اپنے وطن میں نہیں ہوں وہاں کی بہاروں کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ وہاں کے لوگوں کے مسکراتے اور خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن میری پرخلوص تمنائیں، نیک آرزوئیں وطن کے ساتھ ہیں اپنے خدا سے بڑی عاجزی کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے وطن کو ایسی بہار بخش دے جس پر خزاں کا کبھی سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔ بحرین کے بارے میں تمہیں کیا بتاؤں مَیں دوست! یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ دو ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ایک چھوٹی سی ریاست! یہاں کے حکمران کا نام شیخ عیسٰی ہے۔ کہنے کو تو یہ اسلامی ریاست ہے لیکن اسلام ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ انگریز نے دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح یہاں کے لوگوں پر بھی اپنا رنگ بہت اچھی طرح چڑھا دیا ہے۔ اس لیے مذہب کو یہاں ثانوی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ایک ناخوشگوار فرض سمجھ کر مذہبی احکامات کو یہاں کے لوگ ادا کرتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہیں۔ شراب اور عورت ان کی مرغوب چیزیں ہیں۔ دنیا کا ہر فیشن یہاں پہلے پہنچ جاتا ہے۔ ہر نئے سال کی ماڈل کار جہاں تیار ہوتی ہے وہاں بعد میں روڈ پر چلتی ہے لیکن یہاں پہلے ہی پہنچ جاتی ہے۔ تم سوچو گے کہ یہ کیسے ممکن ہے لیکن یہ حقیقت ہے تم جانتے ہو کہ انگریز بڑا چالاک اور کائیاں ہے اور تم نے اس کے بارے میں یہ مقولہ تو سنا ہو گا کہ کسی دَور میں انگریز کا سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ وہ یہاں سے کوڑیوں کے مُول "سیال مادہ" یعنی پٹرول لیتا ہے اور اس کے عوض اپنا ہر فیشن جسے عرفِ عام میں عریانیت کہو —— شراب اور تعیش کا ہر سامان فراہم کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں ایک بازار ہے بہت مشہور —— اپنے بوہری بازار کی ایک یا دو گلیوں کے برابر اس بازار میں شام کے وقت بحرین، نیویارک یا پیرس کا نمونہ پیش کرتا ہے، خوبصورت خوبصورت لڑکیاں —— اسکرٹ، منی اسکرٹ، ہاٹ نیٹ اور نہ جانے کس کس قسم کے لباسوں میں اپنے اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں —— گوری گوری برہنہ رانیں اور اُبھرے ہوئے سینوں کی نمائش عام ہوتی ہے نظارہ کرنے کے لیے کوئی ٹیکس نہیں، کوئی قید نہیں۔ وہ عرب دوشیزہ جس کی ایک جھلک کبھی چرخِ کہن نے بھی نہ دیکھی تھی یہاں تقریباً عریاں ہو کر بازاروں میں جنسی کشش لیے گھومتی نظر آتی ہے۔

انگریزوں نے مسلمانوں سے کیسا انتقام لیا یہ دیکھنا ہو تو مشرقِ وسطیٰ میں آؤ۔ انہیں شراب اور عورت میں اس طرح الجھا دیا ہے کہ وہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان کا ماضی کتنا عظیم تھا اور وہ خود کتنے عظیم ہیں۔

یہ ہے بحرین دوست —— یہاں پر مَیں نے عورت کو ایسے ایسے روُپ میں دیکھا ہے کہ مَیں مرد ہوتے ہوئے بھی شرما گیا ہوں۔

اچھا دوست —— اب اجازت دو —— انشاءاللہ آئندہ خط میں مَیں یہاں کے دوسرے مسائل کے بارے میں تحریر کروں گا —— خدا حافظ

ارشد خان —— بحرین

آپ کو یہ خوش فہمی کیسے ہوئی؟

"تازہ شمارہ ۹/ ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء ہفت روزہ "الفتح" کراچی نظر سے گزرا۔ مجھے بے حد افسوس ہُوا کہ ایک مضمون "فرسودہ روائتیں نئی نسل کو تباہ کر رہی ہیں" میرے نام سے منسوب کر کے صفحہ نمبر ۱۰ پر شائع کیا گیا ہے جس کا مجھے کوئی علم نہیں اور نہ ہی میں نے ایسا کوئی مضمون آپ کو ارسال کیا تھا۔ آپ فوری طور پر اگلے شمارہ میں اس کی تردید

کردی ورنہ میں حکام بالا تک پہنچانے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا۔ اگر مجھے ۳۰ مارچ ۱۹۷۲ء تک کوئی جواب تحریری طور پر نہ ملا تو پھر میں اس سلسلے میں ضروری کارروائی کروں گا اور اس کی اطلاع وزارتِ اطلاعات و نشریات تک پہنچاؤں گا۔

منیر جہلمی گورنمنٹ نارمل اسکول جہلم (پنجاب)

یہ مضمون کراچی کے منیر جہلمی صاحب نے لکھا ہے آپ کو کیسے خیال ہوگیا کہ آپ کا کوئی ہمنام نہیں ہوسکتا۔ (ادارہ)

بقیہ :- چین میں ۴۸ گھنٹے

تیرے دامن میں سکوں،
میں تہی چشم، تہی قلب، تہی دامن ہوں۔
میرے چہرے پر شکستوں کی کہانی پڑھ لے۔
میری آنکھوں کی اداسی ہے مرے پیارے وطن کی تصویر
عزم جو خواب ہوئے۔
حوصلے راکھ ہوئے
آبرو خاک ہوئی
اب نہ عظمت، نہ انا
سر جھکائے ہوئے اور ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے۔
ایک دنیا کی نگاہیں ہم پر

ہم کہ پھر اٹھیں نیا عزم لئے
کرچیاں اپنی چنیں،
تیری آنکھوں کی خوشی، میری خوشی بن جائے۔
تیرے چہرے کا تبسم مرے لب پر بھی ہو۔
تیری گلیوں کا سکوں میرا سکوں بن جائے
اپنی منزل کا یقیں اور بشارت مل جائے۔

میرے ذہن میں امڈے ہوئے جذبے نظم میں ڈھل گئے ہیں۔ ایئر ہوسٹس بتا رہی ہے۔ ہم کراچی پہنچ گئے ہیں۔ ایئرپورٹ ویران ہے۔ کوئی تو ڈر ہے نہ کوئی چیک کرنے والا کیونکہ کہ شیڈول کی پرواز نہیں ہے۔ ہمارے پاسپورٹ پر جاتے وقت تو یہ اندراج ہوا تھا کہ "پاکستان سے اسلام آباد ایئرپورٹ سے روانہ ہوا۔ ۱۱ جنوری کو ـــــ" مگر نہ چین میں کسی نے ہمارے داخلے کا اندراج کیا اور نہ پاکستان میں کسی نے ہماری واپسی کا اندراج کیا۔ پنڈی میں ہم اترے نہیں وہاں تک یہ بین الاقوامی پرواز تھی۔ کراچی میں یہ اندرونی پرواز ہوگئی۔ ہم امیگریشن کے کاغذات میں اب تک پاکستان سے باہر ہی ہیں۔

بقیہ :- ٹائپسٹوں کے مسائل

ملتی ہیں اور ٹائپسٹ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے خواہش مند ہوں ان کو ادارے کی جانب سے وظیفہ ملنا چاہیئے۔

حکومتِ پاکستان کو چاہیئے کہ وہ فوری طور پر اس ملک کے دس لاکھ ٹائپسٹوں کے مسائل کو حل کرے اور مرقومہ بالا اسکیل اور مراعات پر غور کرکے نافذ کردے۔ جس کا اطلاق تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں پر یکساں ہو۔ جہاں مزدوروں کسانوں اور ملک کے دوسرے عوام کی بھلائی کے لئے اتنا کچھ کیا جارہا ہے۔ وہاں ملک کے دس لاکھ ٹائپسٹوں کے مسائل کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ کی جائے۔

بقیہ :- شمالی شینی کی یادیں

صدر ماؤ نے بیٹھتے ہی مشینی انداز میں ایک سگریٹ نکالا اور اسے ہاتھ پر ٹھونکنے کے بعد اپنی ناک کی طرف لے گئے اور اسے سونگھنے لگے۔ ایسا لگا جیسے وہ سگریٹ پینا چاہتے ہوں۔ محافظ چانگ چین کو نے پوچھا "جناب صدر! کیا آپ سگریٹ پینا چاہتے ہیں؟ یہ رہی ماچس۔ یہ اب بھی خشک ہے"۔

صدر ماؤ نے کہا "سگریٹ نوشی کی ممانعت ہے ---!" اور یہ کہہ کر انہوں نے سگریٹ دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لی۔ (باقی آئندہ)

بقیہ :- نئی تعلیمی پالیسی

کی حاضری نہیں لی جاتی اور ان کے لیکچر کم نہیں ہوتے لہٰذا دو تہائی لڑکے کبھی کالج میں آتے ہی نہیں اور سال بھر بعد صرف فیس دے کر امتحان میں بیٹھ جاتے ہیں اور پاس ہونے کے لیے دوسرے غیر مناسب ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ باقی آنے والے طلباء کو کلاسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے اور ایک ایک کلاس میں ڈیڑھ دو سو لڑکے بٹھائے جاتے ہیں۔ اس صورت میں مالکان کو کتنا فائدہ ہوتا ہے اس کا اندازہ لگائیے۔ صبح شام کی شفٹوں میں بالفرض تین ہزار لڑکوں نے داخلہ لیا جن میں سے ڈیڑھ دو ہزار لڑکے کبھی کلاسوں میں نہیں آتے لیکن فیس برابر دیتے ہیں اب گویا کالج میں باقاعدہ آنے والے لڑکے ایک ہزار رہ گئے ہیں۔ ان ایک ہزار کے لیے انتظامیہ لیکچرر رکھے گی اور وہ بھی مطلوبہ تعداد سے کم۔ دو ہزار لڑکوں کی ساری فیس انتظامیہ کی جیب میں جاتی ہے اور ان پر کسی قسم کے اخراجات بشمول اساتذہ جن کا تقرر تعداد کے لحاظ سے کرنا چاہیئے، نہیں ہوتا اور یوں تعلیمی وڈیروں کی ذاتی منفعت کی خواہش کے پیش نظر ہر سال لاکھوں لڑکے بغیر پڑھے پاس ہوکر معاشرے کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں۔

بقیہ : اداریہ

کے درمیان اصولی اختلافات ہیں۔ دونوں پارٹیوں کی داخلہ اور خارجہ پالیسی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا نیپ عین موقع پر پینترا بدلے گی، ایسا ہی ہوا۔

اور آج ان حالات میں ولی خان جو کھیل کھیل رہے ہیں ان کے حامی مہاجر، سندھی، پنجابی، پٹھان، نئے اور پرانے کا جو سوال اٹھا رہے ہیں۔ زبان کو تعصب، نفرت اور انتشار کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ غریبوں کو غریبوں سے، ہاریوں کو ہاریوں سے، مزدوروں کو مزدوروں سے، مظلوموں کو مظلوموں سے لڑوا رہے ہیں۔ اس کا ایک ہی مقصد ـــــ وہ یہ کہ بیرونی جارحیت کے داخلی محاذ کو کمزور کر دیا جائے۔ یہ ایک خوفناک چال ہے۔

ان حالات میں سیاسی کارکنوں کو اپنا بنیادی فرض ادا کرنا ہوگا۔ وہ قریہ قریہ پھیل جائیں۔ اپنی صفوں کو منظم کریں۔ دشمن حملے کے لیے بھرپور تیاریوں میں مصروف ہے، یہ حملہ ممکن ہے ہتھیاروں سے نہ ہو بلکہ پہلے وہ ہماری جڑیں کھوکھلی کرے۔ اس کا مقابلہ آج ہی سے ہونا چاہیئے۔

وہ یہ نہ دیکھیں کہ پیپلز پارٹی نے نیپ سے ایک معاہدہ کر رکھا ہے لہٰذا نیپ کو کھلی چھٹی دے دی جائے۔ وہ نیپ، جماعتِ اسلامی اور ان کے قبیلے کی دوسری جماعتوں سے ہوشیار رہیں اور عوام سے گہرا رابطہ قائم رکھیں۔ وزیروں اور مشیروں کے دفاتر کے طواف کی بجائے اپنے سیاسی عمل کو تیز کر دیں۔

ایڈیٹر

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا بیباک ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۱۲ مئی ۱۹۷۲ء کو اپنی دوسری سالگرہ پر * حسب روایت ایک اہم اور تاریخی

سالنامہ

پیش کر رہا ہے

جس میں تمام عوام دوست اہل قلم، تمام عوامی مسائل پر

اپنے بے باکانہ اور بے لاگ خیالات کا اظہار کریں گے

صفحات :— ۲۰۰

قیمت :— ۲ روپے

ایجنٹ حضرات اور مشتہرین کرام نوٹ فرمالیں

جنرل مینیجر ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی نرسری کمرشیل ایریا کراچی ۲۹

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
6 – 13 - APRIL - 1972

Haqqi Offset Press Karachi.